حوادث الفتاوی
جدید مسائل اور ان کا حل
جلد چہارم
تالیف
حبیب الامت عارف باللہ
حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم
شیخ الحدیث وصدر مفتی، بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ دار العلوم مہذب پور سنجر پور، اعظم گڑھ، یوپی
خلیفہ ومجاز بیعت
حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی وحضرت مولانا عبد الحلیم صاحب جونپوری
ناشر
مکتبہ حبیب الامت جامعہ اسلامیہ دار العلوم
مہذب پور، پوسٹ سنجر پور ضلع اعظم گڑھ، یوپی (انڈیا)

حوادث الفتاوی

(جلد چہارم)

تالیف:

حبیب الامت، عارف باللہ

حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مفتی

بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور، سنجرپور، اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا

خلیفہ و مجاز بیعت

حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ وحضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوریؒ

ناشر

مکتبہ حبیب الامت

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور، پوسٹ سنجرپور، ضلع اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا

نام کتاب: حوادث الفتاوی (جلد چہارم)

مصنف: حضرت مولانا مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی دامت برکاتہم

صفحات: 384

تعداداشاعت: 1100

قیمت: 400

ناشر: مکتبہ حبیب الامت، جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور
پوسٹ سنجرپور، ضلع اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا

ملنے کے پتے

۱- مکتبہ حبیب الامت جامعہ اسلامیہ دارالعلوم مہذب پور، سنجرپور، اعظم گڈھ، یوپی

۲۔ مکتبہ الحبیب خانقاہ حبیب گوونڈی ممبئی

۳- مکتبہ الحبیب وخانقاہ حبیب جھٹکاہی ڈھاکہ ضلع مشرقی چمپارن

۴- مکتبہ طیّبہ دیوبند، سہارنپور

فہرست

پیش لفظ

علم وتحقیق کا فریضہ: عظیم وراثت اور ذمہ داری

علم وتحقیق کا میدان انسانیت کے سب سے اہم اور نازک شعبوں میں سے ایک ہے۔ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو عزم، علمی گہرائی، اور انتھک محنت کا متقاضی ہے۔ محض علم کے شوق سے آگے بڑھ کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھنے والے افراد کو کتابوں کا عاشق ہونا پڑتا ہے، اپنی زندگی کے لمحات کو علم کے حصول میں وقف کرنا پڑتا ہے اور اپنے اکابر کی رہنمائی میں علمی سرمایہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔

فقہ جیسے وسیع اور گہرے موضوع پر تحقیق کرنا اور قلم اٹھانا، ایک عظیم اور نازک ذمہ داری ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا:

''إذا لم يعلم الرجل كيف يُفتىٰ فلا يَحِلُّ له أن يفتي'' (مراجع: التهذيب في اصول الفقه، صفحہ 35، دار الكتب العربيه)

ترجمہ: ''جب کوئی شخص یہ نہ جانتا ہو کہ فتویٰ کیسے دینا ہے تو اس کے لیے فتویٰ دینا حلال نہیں''۔

یہی وہ احساس ہے جو ایک محقق کو مزید احتیاط اور علمی گہرائی پر مجبور کرتا ہے۔ فقہ کا یہ میدان علم وحکمت، گہرے مطالعہ، اور عمیق غور وفکر کے بغیر عبور نہیں کیا جا سکتا۔

علمی وراثت اور خاندانی اثرات:

الحمد للہ، اس خادم کو بھی اپنے اکابر کی صحبت اور رہنمائی سے جو علمی سرمایہ نصیب ہوا، وہ میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔ان کی تربیت اور ہدایات نے مجھے نہ صرف درس وتدریس بلکہ تصنیف وتالیف میں بھی نمایاں کامیابی عطا کی۔اس خادم نے تدریس کی عظیم نعمت سے ہر درجے میں فیض حاصل کیا، میزان سے لے کر دورۂ حدیث اور افتاء و تخصص فی الحدیث تک تدریس کا شرف حاصل ہوا۔

تصنیف وتالیف:

علمی خدمت کا تسلسل:

الحمد للہ، تصنیف وتالیف کا ابتداء ہی سے میرا مزاج رہا، جس کے نتیجے میں اب تک 45 علمی کتب شائع ہو کر اہل علم کی توجہ اور تحسین کا مرکز بن چکی ہیں۔ان کتابوں میں نہ صرف فقہی مسائل بلکہ جدید دور کے اہم موضوعات پر تحقیقی مقالات بھی شامل ہیں۔

امام شافعیؒ نے فرمایا:

”**من تعلم العلم لله كان العلم نورًا له بين يديه و كان طريقه الى الجنة**“ (المجموع، امام النووی، جلد 1، صفحہ 24، مطبع دار الفکر)

ترجمہ: ”جو شخص علم کو اللہ کے لیے حاصل کرے، وہ علم اس کے لیے روشنی بن جاتا ہے اور جنت کا راستہ ہموار کرتا ہے“۔

''حوادث الفتاویٰ'' کی اشاعت:

مختلف علمی اداروں اور فقہی اکیڈمیوں سے موصول ہونے والے جدید اور نازک مسائل پر تحقیقی انداز میں جوابات تحریر کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ان میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، ادارۃ المباحث الفقہیہ دہلی، اور مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنو جیسے معتبر ادارے شامل ہیں۔ان سوالات کے جوابات اکابر علماء کی رہنمائی میں تحقیقی مقالات کی شکل میں پیش کیے گئے، جو بعد میں ایک عظیم ذخیرے کی صورت میں جمع ہو گئے۔

ان مقالات کی افادیت اور تاثیر کو دیکھتے ہوئے نوجوان فضلاء نے اصرار کیا کہ یہ تحریریں شائع کی جائیں۔اس مطالبے کو قبول کرتے ہوئے ''حوادث الفتاویٰ'' کے عنوان سے اس ذخیرے کی اشاعت کا آغاز کیا گیا، جس کی تین جلدیں پہلے ہی علمی دنیا میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔اب الحمد للہ، اس سلسلے کی چوتھی جلد بھی قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

اکابر کا طرز عمل:

تحقیق وتصنیف میں احتیاط:

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''الفتوی تغییر للواقع بشرع الله، فمن لم یدرک الواقع

ولاالشرع کانت فتاواه مناقضة لحکم الله فی کثیر من الأمور“
(مجموع الفتاویٰ، جلد 3، صفحہ 288، دار ابن حزم)

ترجمہ: ”فتویٰ اللہ کے حکم سے حالات کو بدلنے کا نام ہے، جو شخص نہ حالات کو سمجھے اور نہ شریعت کو، اس کے فتوے اکثر اللہ کے حکم کے خلاف ہوں گے“۔

اسی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے، تحقیق کا ہر پہلو اکابر کے اصولوں پر مبنی رہا، تاکہ یہ کام نہ صرف قارئین کے لیے رہنما ہو بلکہ تحقیق کے میدان میں ایک معیار بھی قائم کرے۔

دعا اور امید:

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس خادم کے علمی و تحقیقی کام کو امت کے لیے رہنمائی اور خیر کا ذریعہ بنائے اور اس عاجز کے لیے رضائے الٰہی اور آخرت میں کامیابی کا سبب قرار دے۔

مفتی حبیب اللہ قاسمی
خادم الحدیث والافتاء
بانی و مہتمم جامعہ اسلامیہ دار العلوم
مہذب پور، سنجر پور، اعظم گڑھ

تاریخ: 15/07/1446ھ مطابق 16/01/2025ء

جمعہ کے لیے مصر ہونے کی شرط موجودہ حالات کے پس منظر میں

موجودہ حالات میں مصر کی تعریف

سوال:(1)

فقہائے حنفیہ نے بعض دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے قیامِ جمعہ کے لیے مصر یا قریہ جامعہ ہونے کی شرط لگائی ہے؛ لیکن نصوص میں مصر کا مفہوم واضح طور پر نہیں آیا ہے، فقہاء حنفیہ کے درمیان بھی اس میں خاصا اختلاف ہے، موجودہ دور میں جو ترقی ہوئی ہے، اس کے تحت پہلے جو سہولتیں چھوٹے موٹے شہروں میں میسر ہوتی تھیں، وہ اب بہت سے بڑے دیہاتوں میں بھی مہیا ہوگئی ہیں، اور جیسا کہ اوپر ذکر آیا موجودہ دور میں جمعہ بہت سے ناخواندہ اور کم خواندہ مسلمانوں کے ایمان کے تحفظ کا ذریعہ بھی ہے، اس پس منظر میں موجودہ حالات میں مصر کی کیا تعریف ہوسکتی ہے؟ جس سے اس کے اطلاق کا دائرہ وسیع ہوجائے؟

جواب:(1)

فقہائے حنفیہ نے جمعہ کی صحت کے لیے مصر یا قریہ جامعہ کی شرط اس لیے لگائی ہے تاکہ جمعہ ایک اہم اور قابل احترام اجتماع کی شکل میں ادا کیا جائے اور اس کی

شرائط و آداب کی تکمیل ہو سکے۔ نصوصِ شرعیہ میں مصر کی واضح تعریف نہیں آئی، لیکن فقہاء نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اور وقت کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی وضاحت کی ہے۔

مصر کی تعریف فقہائے حنفیہ کی نظر میں:

فقہائے حنفیہ کے مطابق مصر وہ جگہ ہے جہاں:

۱-قاضی کا تقرر ہو: یعنی شرعی فیصلے صادر کرنے والا قاضی موجود ہو۔

۲-جامع مسجد ہو: جہاں جمعہ اور عیدین کی نماز باقاعدگی سے ادا کی جاتی ہو۔

۳-رہائش اور معیشت کے وسائل ہوں: یعنی ایک مستقل آبادی موجود ہو اور لوگ اپنی ضروریات زندگی وہیں سے پوری کرتے ہوں۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"وأما الشرائط التي ترجع إلى مكان الجمعة، فهي أن تكون في مصر جامع، أو في مصلى المصر على قول أبي حنيفة، وفي الجامع خاصة على قولهما، والمصر الجامع هو الذي له حائط وسور، أو أمير وقاضٍ ينفذ الأحكام، أو أسواقٌ قائمةٌ" (بدائع الصنائع، ج1، ص261)

موجودہ دور کے حالات میں مصر کی تطبیق:

موجودہ دور میں مصر کی وہ خصوصیات جو فقہائے حنفیہ نے بیان کی ہیں، چھوٹے بڑے دیہاتوں اور قصبوں تک وسیع ہو چکی ہیں، کیونکہ:

۱- دیہاتوں میں بڑی تعداد میں ایسے علاقے موجود ہیں جہاں بڑی آبادی ہے۔

۲- جامع مساجد قائم ہیں اور ان میں جمعہ کی نماز کے لیے کثیر تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔

۳- جدید سہولیات جیسے تعلیم، معیشت، بازار، اور عدالتی معاملات تک رسائی آسان ہو چکی ہے۔

۴- ناخواندہ اور کم خواندہ مسلمانوں کے لیے جمعہ ایمان کی حفاظت اور دین کی تعلیم کا اہم ذریعہ بن چکا ہے۔

فقہ حنفی کے اصول اور موجودہ دور کی سہولیات

فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق اگر کسی جگہ پر جمعہ کی شرائط پوری ہوں، جیسے کہ:

۱- مناسب تعداد میں افراد کا اجتماع ہو (کم از کم تین افراد کے ساتھ امام)۔

۲- جامع مسجد موجود ہو۔

۳- لوگوں کی رہائش اور معیشت کا مرکز ہو۔

تو وہاں جمعہ قائم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

امام سرخسی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"والمراد بالمصر الجامع ما جرت العادة فيه بإقامة الجمعة فيها لكونها مجمعا للناس" (المبسوط، ج2، ص23)

نتیجہ:

موجودہ دور میں دیہات یا چھوٹے قصبے جو بنیادی ضروریات اور سہولیات سے آراستہ ہیں، انہیں مصر جامع کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے، کیونکہ اصل مقصد اجتماع اور خطبے کے ذریعے مسلمانوں کو دین سے جوڑنا ہے۔ اگر دیہاتوں میں جمعہ ترک کیا جائے تو دینی تربیت کا اہم ذریعہ ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا، جہاں یہ شرائط مکمل ہوں، وہاں جمعہ قائم کرنا درست ہے۔

چھوٹی آبادی میں قیام جمعہ کا حکم

سوال:(2)

جہاں مسلمانوں کی باقاعدہ آبادی ہو، چاہے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو، نماز باجماعت کا مسجد کے ساتھ یا مسجد کے بغیر نظام ہو، کیا وہاں جمعہ کا نظام بنایا جا سکتا ہے۔

جواب(2)

مسلمانوں کی باقاعدہ آبادی جہاں موجود ہو، خواہ وہ تعداد میں کم ہی کیوں نہ ہوں، اگر وہاں نماز باجماعت کا انتظام موجود ہے اور مناسب جگہ بھی موجود ہے، تو فقہ حنفی کی روشنی میں وہاں جمعہ قائم کرنا جائز ہے، بشرطیکہ جمعہ کی شرائط پوری ہو رہی ہوں۔

جمعہ کی شرائط:

فقہ حنفی کے مطابق جمعہ کے لیے چند اہم شرائط درج ذیل ہیں:

۱-شہر یا قصبہ: فقہ حنفی میں جمعہ کا قیام ایسے مقام پر جائز ہے جہاں شہر یا قصبے کی حیثیت موجود ہو یا اس کے نواحی علاقے میں ہو۔ چھوٹے گاؤں میں جمعہ کی اجازت فقہائے احناف نے اصولی طور پر نہیں دی، البتہ موجودہ دور میں اس پر علماء نے کچھ رعایت دی ہے۔

۲-مسلمانوں کی آبادی: وہاں کم از کم اتنے مسلمان موجود ہوں جو نماز جمعہ کے شرکاء کی حد پوری کر سکیں۔

۳-اذنِ عام: جمعہ کی نماز عام مسلمانوں کے لیے کھلی ہو، یعنی کسی خاص طبقے یا گروہ تک محدود نہ ہو۔

۴-حکومت یا امیر کی اجازت: جمعہ کی اجازت اسلامی حکومت یا علاقے کے ذمہ دار علماء سے لی جائے۔

فقہ حنفی کی مستند کتب سے حوالہ:

۱-الدر المختار میں ہے:

"وأما شرائط الوجوب فأربعة: الإسلام والحرية والذكورة والإقامة، وشرائط الصحة الجماعة والسلطان أو نائبه والوقت

والخطبة والإعلان وکون المکان مصراً لصحة الجمعة" (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ، ج2،ص143)

۲-فتاویٰ ہندیہ میں ذکر ہے:

"ولو کانوا فی موضع منقطع فی قریة صغیرة والناس کلهم مسلمون جاز لهم إقامة الجمعة إذا کان لهم مسجد یصلون فیه جماعة" (الفتاویٰ الہندیۃ، ج1،ص151)

علماء ہند کی رائے:

علماء ہند کے نزدیک ایسی جگہ جہاں مسلمان موجود ہوں اور شرائطِ جمعہ مکمل ہوں، وہاں جمعہ قائم کرنا جائز ہے۔لیکن اگر تعداد بہت کم ہواور انتظامات ناقص ہوں، تو بہتر یہی ہے کہ نماز ظہر باجماعت ادا کی جائے اور قریبی بڑی مسجد میں جمعہ کی کوشش کی جائے۔

مفتی کفایت اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

"اگر گاؤں میں مسلمانوں کی تعداد کم ہولیکن وہ اجتماعی طور پر نماز پڑھ سکتے ہوں اور مسجد موجود ہو،تو جمعہ پڑھنا جائز ہے،بشرطیکہ شرائط کی تکمیل ہورہی ہو" (کفایت المفتی، ج3،ص183)

خلاصہ:

اگر مسلمانوں کی آبادی ایسی جگہ پر موجود ہو جہاں شرائط جمعہ پوری ہورہی ہیں

اور نماز با جماعت کا نظام قائم ہے، تو وہاں فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق جمعہ قائم کیا جا سکتا ہے۔تاہم، علماء سے مشورہ کرنا اور حالات کے مطابق فیصلہ لینا ضروری ہے۔

کیا گاؤں میں مسلمانوں کو گمراہیوں سے بچانے کے لئے جمعہ قائم کرنا درست ہے؟

سوال:(3)

اور کیا گاؤں میں جمعہ ادا کرنے کی اجازت اس مقصد کے پیش نظر دی جا سکتی ہے کہ یہ نظام عام مسلمانوں اور مسلمانوں کے عام طبقات کو بہر حال کسی نہ کسی درجہ میں دین سے جوڑ کر رکھے گا، ان کے ایمان کی حفاظت کرے گا، اور اس کے واسطے سے آج کے گمراہ فتنوں سے ان کو آگاہ کیا جا سکے گا؟

جواب:(3)

فقہ حنفی کی رو سے جمعہ کی نماز کے قیام کے لیے چند بنیادی شرائط ہیں جن کا ذکر فقہ کی معتبر کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ان شرائط میں سے ایک شرط شہر یا قصبہ ہونا ہے۔گاؤں میں جمعہ کی نماز کے جواز کے سلسلے میں علمائے کرام کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم فقہ حنفی کے مشہور اور معتمد موقف کے مطابق گاؤں میں جمعہ ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ گاؤں کو وہ شرائط حاصل نہیں جو جمعہ کے لیے

ضروری ہیں۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے دلائل:

۱-فتاوی عالمگیری میں ذکر ہے:

"**ولا يصح في القرية عندنا**" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، صفحہ 150)

یعنی ہمارے نزدیک گاؤں میں جمعہ صحیح نہیں ہے۔

۲-ہدایہ میں ہے:

"**شرائط الجمعة أن يكون في مصر أو في قرية كثيرة السكان**" (ہدایہ، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ)

یعنی جمعہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ شہر یا بڑی بستی میں ہو، جہاں نظم ونسق قائم ہو اور بڑی تعداد میں لوگ موجود ہوں۔

علمائے ہند کی آراء:

ہندوستان کے علمائے کرام نے اس مسئلے میں مختلف زاویوں سے گفتگو کی ہے:

۱-علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گاؤں میں جمعہ ادا کرنے کی ممانعت اس لیے ہے تاکہ نظامِ شریعت کے حدود وقیود محفوظ رہیں اور اس عمل کو عام نہ کیا جائے جس سے شریعت کے اصول متاثر ہوں۔

۲-مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتابوں میں اس مسئلے کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور گاؤں میں جمعہ کے عدم جواز کو راجح قرار دیا ہے، مگر اس

کے ساتھ ساتھ دین کی دعوت اور مسلمانوں کو دین سے جوڑنے کے دیگر ذرائع پر زور دیا ہے۔

جدید حالات اور فتنے:

آج کل کے دور میں گمراہی اور فتنوں کے پیش نظر بعض علماء اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ اگر گاؤں میں بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوں، اور دین سے دوری کا شدید اندیشہ ہو، تو ایسے گاؤں میں جمعہ کی اجازت دی جا سکتی ہے، بشرطیکہ وہاں ایک مضبوط دینی ماحول قائم کیا جائے اور علماء کرام کی نگرانی میں جمعہ کا اہتمام ہو۔ لیکن یہ رخصت اضطراری حالات میں ہی ہوگی، ورنہ اصل حکم یہی ہے کہ جمعہ شہر یا قصبے میں قائم کیا جائے۔

خلاصہ:

فقہ حنفی کے معتمد موقف کے مطابق گاؤں میں جمعہ ادا کرنا جائز نہیں، البتہ خاص حالات میں، جب دین کی حفاظت اور فتنوں سے بچاؤ کا مقصد ہو، تو علماء کی نگرانی میں گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ اس مسئلے کو حکمت اور تدبر کے ساتھ حل کرنا چاہیے تاکہ دین اور شریعت کی روح محفوظ رہے۔

خواتین کی ڈرائیونگ سے متعلق بعض مسائل

شہر میں عورتوں کے لئے گاڑی چلانے کا حکم

سوال:(1)

کیا کوئی عورت شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ تنہا گاڑی چلا کر جا سکتی ہے؟ اس میں دو پہیوں والی گاڑی، کار، ٹیکسی، بس یا سامان پہنچانے والی گاڑی جیسے لاری وغیرہ کے احکام ایک ہی ہیں یا الگ الگ؟

جواب:(1)

عورت کا گاڑی چلانا اور شہر کے اندر تنہا سفر کرنا فقہِ حنفی اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں مختلف پہلوؤں کا حامل ہے۔اس سلسلے میں درج ذیل تفصیل پیش کی جاتی ہے:

۱۔عورت کا گاڑی چلانا اور تنہا سفر:

عورت کا گاڑی چلانا بذاتِ خود جائز ہے، اگر شرعی پردہ کی رعایت ہو اور دیگر شرعی تقاضے پورے کیے جائیں۔فقہِ حنفی کی رو سے خواتین کے لیے سفر کا حکم یہ ہے کہ وہ تنہا کسی شرعی سفر (مسافتِ شرعی 48 میل یا اس سے زائد) پر نہیں جا سکتیں،

کیونکہ حدیث شریف میں اس سے منع کیا گیا ہے۔

حدیث شریف:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ مَسِيرَةَ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ" (بخاری، کتاب الصوم، باب صوم یوم الفطر، حدیث نمبر:1088)

ترجمہ: عورت کے لیے ایک دن اور رات کی مسافت کا سفر بغیر محرم کے جائز نہیں۔

لہٰذا، اگر عورت کا سفر شہر کے اندر ہو (جس میں شرعی مسافت نہ پائی جائے) اور وہ تنہا سفر کر رہی ہو تو اس میں کچھ شرطوں کے ساتھ گنجائش ہے، جیسے:

۱-شرعی پردے کا اہتمام ہو۔

۲-راستہ محفوظ ہو اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔

۳-عورت کا یہ عمل عفت وعصمت اور حیا کے خلاف نہ ہو۔

۲-مختلف گاڑیوں کا حکم:

جہاں تک دو پہیوں والی گاڑی، کار، ٹیکسی، بس، یا بڑی گاڑی جیسے لاری وغیرہ کا تعلق ہے، ان تمام کے اصول ایک ہی ہیں۔ بنیادی طور پر اصل حکم عورت کے سفر اور پردے کا ہے، نہ کہ گاڑی کی قسم کا۔

البتہ، بڑی گاڑیوں جیسے بس یا لاری وغیرہ چلانے میں یہ پہلو زیادہ اہمیت

رکھتا ہے کہ:

۱- یہ عموماً مردوں کے ماحول میں ہوتا ہے، جہاں اختلاط کا اندیشہ ہے۔

۲- فتنہ کے اسباب زیادہ ہوتے ہیں۔

اس لیے فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق ایسی گاڑیوں کے چلانے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

فقہ حنفی کی کتب سے دلائل:

۱- فقہ حنفی میں عورت کا پردہ اور سفر:

علامہ ابن نجیم حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وَتُمنَعُ المرأةُ الشَّابَّةُ مِن الخروجِ إِلَى الطُّرُقَاتِ إِلَّا لحاجَةٍ لِمَا فِيهِ مِن التُّهمَةِ، وَفِي المُختَصَرِ يُمنَعنَ لِمَا فِيهِ مِن التَّهتُّكِ"

(البحر الرائق شرح کنز الدقائق، ج3، ص63، دار الکتاب الإسلامی)

ترجمہ: جوان عورتوں کو بلاضرورت راستوں پر نکلنے سے روکا جائے گا کیونکہ اس میں فتنہ وفساد کا اندیشہ ہے۔

۲- فتنہ کا اندیشہ:

علامہ مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لِأَنَّ فِي خُروجِهَا إِلَى السُّوقِ مَظِنَّةَ الفِتنَةِ، فَيَكُونُ مَكرُوهًا"

(الھدایہ مع فتح القدیر، ج1، ص197، دار الفکر)

ترجمہ: عورت کے بازار میں نکلنے میں فتنہ کا اندیشہ ہوتا ہے، لہٰذا یہ مکروہ ہے۔

نتیجہ:

۱-عورت کا گاڑی چلانا بذاتِ خود جائز ہے، بشرطیکہ وہ پردے کا اہتمام کرے اور فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو۔

۲-شہر کے اندر اگر شرعی مسافت (48) میل نہ ہوتو تنہا عورت کا سفر جائز ہے، لیکن احتیاط اور حفاظت کے پہلو کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

۳-بڑی گاڑیوں (بس، لاری وغیرہ) چلانے میں چونکہ مردوں سے اختلاط اور دیگر فتنہ کے اسباب زیادہ ہوتے ہیں، اس لیے اس سے پرہیز کرنا افضل ہے۔

مسافت شرعی کی مقدار کا سفر محرم کے ساتھ عورت گاڑی چلا کر کرسکتی ہے؟

سوال: (2)

اگر مسافت شرعی کی مقدار کا سفر ہو اور مذکورہ سواریوں میں عورت کا شوہر یا محرم بھی ساتھ ہو تو کیا اس کی اجازت ہے؟

جواب: (2)

عورت کا مسافتِ شرعی 48 (میل یا اس سے زائد) کا سفر کرنے کے لیے

شریعتِ مطہرہ میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ اگر عورت کے ساتھ اس کا شوہر یا کوئی محرم ہو تو فقہ حنفی کی روشنی میں یہ سفر جائز ہے۔ ذیل میں اس حکم کی تفصیل اور دلائل ذکر کیے جاتے ہیں:

۱- شوہر یا محرم کے ساتھ سفر کی اجازت:

اسلامی شریعت میں عورت کو تنہا سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے، مگر جب شوہر یا کوئی محرم اس کے ساتھ ہو تو یہ ممانعت ختم ہو جاتی ہے۔

حدیث شریف:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِی مَحْرَمٍ'' (صحیح بخاری، کتاب الحج، باب حج النساء، حدیث نمبر:1862)

ترجمہ: عورت سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ کوئی محرم ہو۔

فقہِ حنفی کے اصولوں کے مطابق جب عورت کے ساتھ شوہر یا محرم موجود ہو تو مسافتِ شرعی کا سفر جائز ہو جاتا ہے۔

۲- فقہ حنفی کی کتب سے دلائل:

۱- علامہ ابن نجیم حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَلَا يَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تُسَافِرَ سَفَرًا طَوِيلًا بِلَا زَوْجٍ أَوْ مَحْرَمٍ......

لِأَنَّ السَّفَرَ مَظِنَّةُ التَّهْلُكَةِ، وَفِي صُحْبَةِ الزَّوْجِ أَوْ الْمَحْرَمِ حِفْظٌ وَصِيَانَةٌ" (البحر الرائق شرح کنز الدقائق، ج3، ص65، دار الکتاب الإسلامی)

ترجمہ: عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ طویل سفر کرے بغیر شوہر یا محرم کے ...... کیونکہ سفر میں ہلاکت (خطرہ) کا اندیشہ ہوتا ہے، اور شوہر یا محرم کی رفاقت میں حفاظت اور صیانت ہوتی ہے۔

۲- علامہ مرغینانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"لَا يَحِلُّ لَهَا أَنْ تَسِيرَ مَسِيرَةَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فَصَاعِدًا إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ، لِحَدِيثِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" (الہدایہ مع فتح القدیر، ج2، ص473، دار الفکر)

ترجمہ: عورت کے لیے تین دن یا اس سے زائد مسافت کا سفر بغیر محرم کے جائز نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی بنا پر۔

۳- علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَلِأَنَّ السَّفَرَ طَرِيقُ الْخَطَرِ وَالْمَرْأَةُ ضَعِيفَةٌ، لَا تَقْدِرُ عَلَى الِانْتِصَافِ وَالدِّفَاعِ، فَلَا يُؤْمَنُ فِيهَا الْهَلَاكُ" (بدائع الصنائع، ج2، ص333، دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: کیونکہ سفر خطرے کا باعث ہے اور عورت کمزور ہوتی ہے، وہ اپنے دفاع پر قدرت نہیں رکھتی، اس لیے اس میں ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے۔

۳-شوہر یا محرم کا ہونا کیوں ضروری ہے؟

اسلام نے عورت کے احترام، عزت، اور تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے شوہر یا محرم کی موجودگی کو لازم قرار دیا ہے تا کہ:

۱-سفر میں کسی بھی قسم کا خطرہ یا فتنہ نہ ہو۔

۲-عورت کی عصمت و عفت محفوظ رہے۔

۳-ضرورت کے وقت شوہر یا محرم اس کی معاونت کر سکے۔

نتیجہ:

اگر عورت کے ساتھ مسافتِ شرعی (48) میل یا اس سے زائد) کے سفر میں اس کا شوہر یا محرم موجود ہو تو یہ سفر شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ شرعی پردے کا اہتمام کیا جائے اور دیگر فتنوں سے بچا جائے۔

لیکن اگر شوہر یا محرم نہ ہو تو عورت کے لیے اس سفر کی اجازت نہیں ہے۔

کیا پبلک ٹرانسپورٹ کی ڈرائیونگ عورت کر سکتی ہے؟

سوال:(3)

بعض فقہاء کے نزدیک عورتوں کا قافلہ ہو تو ایک عورت اپنے محرم کے بغیر قافلہ میں شامل ہو سکتی ہے؛ کیونکہ قافلہ میں بہت سی خواتین کی موجودگی فتنہ کے اندیشہ کو کم

کردیتی ہے، کیا پبلک ٹرانسپورٹ کی عورت ڈرائیور کو اس زمرے میں رکھا جا سکتا ہے؟

جواب:(3)

عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنے کے معاملے میں فقہاء کرام نے مختلف صورتوں میں احکام بیان فرمائے ہیں۔سوال میں جس صورت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض فقہاء کے نزدیک قافلہ میں دیگر خواتین کے ساتھ عورت سفر کر سکتی ہے، اس کی حقیقت اور فقہِ حنفی کا موقف درج ذیل ہے:

1-محرم کے بغیر قافلہ میں عورت کا سفر:

فقہ حنفی میں عورت کے لیے محرم یا شوہر کے بغیر سفر کرنا ناجائز ہے، خواہ وہ قافلہ میں ہو یا پبلک ٹرانسپورٹ کے ذریعے۔فقہاء نے اس پر سختی سے حکم بیان کیا ہے اور اس کے لیے کسی بھی استثنا کو قبول نہیں کیا، سوائے اضطراری حالات کے۔

حدیث شریف:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ" (بخاری، کتاب الحج، حدیث نمبر:1862)

ترجمہ: عورت سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ کوئی محرم ہو۔

فقہ حنفی میں اس حدیث کو بنیاد بنا کر سفرِ شرعی (48) میل یا اس سے زائد)

میں محرم کی موجودگی کو لازم قرار دیا گیا ہے، اور اس میں قافلے یا دیگر خواتین کی موجودگی کوئی رعایت پیدا نہیں کرتی۔

۲-فقہ حنفی کے دلائل:

۱-علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَإِذَا كَانَتْ تُسَافِرُ لَا بُدَّ لَهَا مِنْ مَحْرَمٍ أَوْ زَوْجٍ، لِأَنَّ النَّهْيَ وَرَدَ عَنْهُ بِصَرَاحَةِ النُّصُوصِ، وَلَا يَنْدَفِعُ إِلَّا بِإِحْدَاهُمَا" (فتح القدیر، ج2،ص 473، دارالفکر)

ترجمہ: جب عورت سفر کرے تو اس کے لیے محرم یا شوہر کا ساتھ ہونا لازم ہے، کیونکہ نصوص میں صراحت کے ساتھ اس (بغیر محرم سفر) سے منع کیا گیا ہے، اور یہ ممانعت محرم یا شوہر کے بغیر ختم نہیں ہوسکتی۔

۲-علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَإِنَّمَا حَرُمَ السَّفَرُ بِلَا مَحْرَمٍ لِأَنَّ فِي السَّفَرِ مَخَاطِرَ وَمَفَاسِدَ، وَالْمَحْرَمُ يَدْفَعُ ذَلِكَ" (بدائع الصنائع، ج2،ص334، دارالکتب العلمیۃ)

ترجمہ: بغیر محرم کے سفر کو حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ سفر میں خطرات اور مفاسد ہوتے ہیں، اور محرم ان مفاسد کو دفع کرتا ہے۔

۳-قافلے میں سفر کی رائے:

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے بعض فقہاء کے اس قول کا ذکر کیا ہے کہ عورت

قافلہ کے ساتھ سفر کرسکتی ہے، لیکن فقہ حنفی میں اس پر اعتماد نہیں کیا گیا اور اسے غیر معتمد قرار دیا گیا۔

علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں:

"وَقَالَ بَعْضُهُمْ يَجُوزُ فِي رُفْقَةٍ مَأْمُونَةٍ، وَلَكِنَّ الْمُعْتَمَدَ هُوَ مَاعَلَيْهِ الْجُمْهُورُ أَنَّهُ لا يَجُوزُ بِلَا مَحْرَمٍ" (البحر الرائق، ج3،ص66، دار الکتاب الإسلامی)

ترجمہ: بعض نے کہا کہ عورت محفوظ قافلے میں سفر کرسکتی ہے، لیکن معتمد قول وہی ہے جس پر جمہور فقہاء ہیں کہ بغیر محرم کے سفر جائز نہیں۔

۳- پبلک ٹرانسپورٹ میں عورت ڈرائیور کا سفر:

پبلک ٹرانسپورٹ میں اگر عورت ڈرائیور ہو اور وہ مسافتِ شرعی کا سفر کر رہی ہو، تو یہ صورت بھی فقہ حنفی کے حکم کے تحت آتی ہے۔ فقہ حنفی میں سفر کی ممانعت اس لیے ہے کہ:

۱- سفر میں خطرات ہوتے ہیں۔

۲- عورت کی عزت وعفت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

۳- عورت کی تنہائی یا غیر محرم مردوں کے ساتھ اختلاط کا خدشہ رہتا ہے۔

لہٰذا، پبلک ٹرانسپورٹ میں عورت ڈرائیور کو محرم کے بغیر سفر کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، خواہ قافلے میں دیگر خواتین موجود ہوں۔ قافلے میں خواتین کی موجودگی محرم کا متبادل نہیں بن سکتی۔

نتیجہ:

فقہ حنفی کے اصولوں اور دلائل کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ:

۱-عورت کے لیے محرم یا شوہر کے بغیر مسافتِ شرعی (48) میل یا اس سے زائد) کا سفر جائز نہیں ہے۔

۲-خواہ قافلہ میں دیگر خواتین ہوں یا وہ پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کر رہی ہو، یہ ممانعت برقرار رہتی ہے۔

۳-بعض فقہاء نے قافلے کے ساتھ سفر کی جو اجازت دی ہے، فقہ حنفی میں اس پر اعتماد نہیں کیا گیا اور جمہور فقہاء کا قول ہی معتمد ہے۔

مسلم خواتین کے لئے پائلٹ بننے کا حکم

سوال:(4)

آج کل خواتین ہوائی جہاز کی پائلٹ بھی بن رہی ہیں، اور حکومتیں ان کو ترجیح دیتی ہیں، فلائٹ میں سیکیورٹی بہت زیادہ ہوتی ہے، پائلٹ کی ہر چھوٹی بڑی حرکت کیمرے میں ریکارڈ ہوتی رہتی ہے؛ البتہ پائلٹ کے کیبن میں دو افراد ہوتے ہیں، دونوں کی بیٹھک میں فاصلہ بھی ہوتا ہے، اگر خاتون پائلٹ ہو تو ہوسکتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت پائلٹ کیبن میں رہیں، تو کیا مسلمان خواتین اس ملازمت میں شامل ہوسکتی ہیں؟

جواب:(4)

مسلمان خواتین کے ہوائی جہاز کی پائلٹ بننے اور اس ملازمت میں شامل ہونے کا معاملہ اسلامی شریعت کے عمومی اصولوں اور فقہ حنفی کے احکام کی روشنی میں مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ان پہلوؤں میں سب سے اہم درج ذیل ہیں:

۱-عورت کا غیر محرم مرد کے ساتھ خلوت (تنہائی) کا حکم

۲-عورت کے لیے سفر اور پردے کی حدود

۳-عورت کا کام کرنے کے لیے ایسے ماحول میں جانا جہاں فتنہ اور اختلاط کا خدشہ ہو

۱-عورت کا غیر محرم مرد کے ساتھ خلوت:

شریعتِ مطہرہ میں کسی عورت کا غیر محرم مرد کے ساتھ خلوت اختیار کرنا ناجائز ہے، خواہ وہ خلوت مکمل تنہائی کی شکل میں ہو یا نیم خلوت۔ہوائی جہاز کے پائلٹ کیبن میں اگرچہ سیکیورٹی موجود ہو اور کیمرے کی نگرانی ہو، لیکن دو افراد کی موجودگی میں غیر محرم مرد اور عورت کا ایک ساتھ بیٹھنا خلوت کے زمرے میں آ سکتا ہے۔

حدیث شریف:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ" (بخاری، کتاب النکاح،

باب لَا یَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ، حدیث نمبر: 5233)

ترجمہ: کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ ہو، مگر یہ کہ اس کے ساتھ کوئی محرم ہو۔

فقہ حنفی کے مطابق اس حدیث کی بنیاد پر غیر محرم مرد کے ساتھ خلوت مطلقاً ممنوع ہے، چاہے وہاں کیمرہ ہو یا سیکیورٹی کا انتظام۔

۲- عورت کے لیے سفر اور پردے کی حدود:

فقہ حنفی میں عورت کے لیے محرم کے بغیر مسافتِ شرعی (48) میل یا اس سے زائد) کا سفر جائز نہیں ہے، اور یہ حکم عام حالات میں بھی لاگو ہوتا ہے۔

فقہ حنفی کی تصریحات:

علامہ ابن نجیم حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وَلَا تَحِلُّ لَهَا السَّفَرُ إِلَّا مَعَ مَحْرَمٍ أَوْ زَوْجٍ لِظَاهِرِ النَّصِّ، وَلِأَنَّ السَّفَرَ فِيهِ مَخَاطِرُ" (البحر الرائق، ج3، ص65، دار الکتاب الاسلامی)

ترجمہ: عورت کے لیے سفر جائز نہیں ہے، سوائے محرم یا شوہر کے ساتھ، کیونکہ نص (حدیث) واضح ہے، اور سفر میں خطرات موجود ہوتے ہیں۔

ہوائی جہاز کی پائلٹ کے لیے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ لمبے سفر کرے، اور اس میں اکثر صورتوں میں عورت اکیلی ہوتی ہے یا غیر محرم مردوں کے ساتھ۔ لہٰذا شرعی اصولوں کے مطابق یہ عمل درست نہیں ہوگا۔

۳- فتنہ اور اختلاط کا خدشہ:

شریعت نے عورت کے احترام، حیا اور عفت کی حفاظت کے لیے مردوں کے ساتھ بے ضرورت اختلاط سے منع فرمایا ہے۔ پائلٹ کی ملازمت میں مردوں کے ساتھ اختلاط کا قوی امکان ہوتا ہے، اور فقہ حنفی کے اصول کے مطابق یہ اختلاط ناجائز ہے۔

فقہ حنفی کی تصریحات:

علامہ مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لِأَنَّ فِي خُرُوجِهَا إِلَى الطُّرُقَاتِ وَالْمَوَاضِعِ الْعَامَّةِ مَظِنَّةَ الْفِتْنَةِ، فَيَكُونُ مَكْرُوهًا" (الھدایہ مع فتح القدیر، ج1،ص197، دارالفکر)

ترجمہ: عورت کا بازاروں اور عوامی مقامات میں نکلنا فتنہ کا سبب بن سکتا ہے، اس لیے یہ مکروہ ہے۔

۴- پائلٹ کی ملازمت میں مزید شرعی قباحتیں:

۱- پردے کی خلاف ورزی: ہوائی جہاز کے پائلٹ کے لباس اور ڈیوٹی میں پردے کے تقاضے پورے کرنا دشوار ہے۔

۲- مردوں کے ساتھ اختلاط: کیبن میں اور دیگر معاملات میں غیر محرم مردوں کے ساتھ تعلق کا خدشہ رہتا ہے۔

۳- سفر کا تسلسل: پائلٹ کے کام میں عورت کو مسلسل سفر کرنا پڑتا ہے، جس

کے لیے محرم کی رفاقت کا شرعی حکم پورا نہیں ہوتا۔

نتیجہ:

فقہ حنفی کے اصولوں اور اسلامی شریعت کی تعلیمات کے مطابق مسلمان خواتین کے لیے ہوائی جہاز کی پائلٹ بننے کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ:

۱-اس میں غیر محرم مردوں کے ساتھ خلوت اور اختلاط ہوتا ہے۔

۲-عورت کو بغیر محرم کے لمبے سفر کرنے پڑتے ہیں، جو ناجائز ہے۔

۳-شرعی پردے کی مکمل رعایت نہیں ہو پاتی، اور فتنہ کے اندیشے موجود ہوتے ہیں۔

لہٰذا، مسلمان خواتین کو ایسی ملازمت سے اجتناب کرنا چاہیے جو ان کی عفت وحیا اور شرعی حدود کے خلاف ہو۔

عورت کے لئے ٹرین کی ڈرائیونگ کا حکم

سوال:(5)

ٹرینوں میں بھی بہ حیثیت ڈرائیور عورتوں کا تقرر کیا جارہا ہے، تو کیا ان کے لئے ایسی ملازمت جائز ہے؟

جواب:(5)

عورتوں کا ٹرین ڈرائیور کی ملازمت اختیار کرنے کا مسئلہ شرعی احکام اور

فقہ حنفی کے اصول وقواعد کی روشنی میں درج ذیل امور کے پیش نظر واضح کیا جاتا ہے:

ا-عورت کا غیر محرم مردوں کے ساتھ اختلاط:

شریعت میں عورت کو غیر محرم مردوں کے ساتھ بے ضرورت اختلاط سے روکا گیا ہے۔ٹرین چلانے کی ملازمت میں عورت کو نہ صرف مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے بلکہ بعض اوقات مرد معاونین، انجینئرز اور عملے کے ساتھ گفتگو اور اختلاط کی نوبت بھی آتی ہے۔ یہ صورت شرعی پردے کے اصولوں کے خلاف ہے۔

فقہ حنفی کی تصریح:

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَيُكْرَهُ لِلنِّسَاءِ خُرُوجُهُنَّ لِلْأَسْوَاقِ وَالطُّرُقَاتِ لِأَنَّهُ مَظِنَّةُ الْفِتْنَةِ" (ردالمحتار علی الدر المختار، ج6،ص 371، دارالفکر)

ترجمہ: عورتوں کا بازاروں اور راستوں میں نکلنا مکروہ ہے کیونکہ یہ فتنے کا سبب بن سکتا ہے۔

۲-عورت کا سفرِ شرعی بغیر محرم کے کرنا:

شریعت نے عورت کے لیے محرم کے بغیر سفر کو ممنوع قرار دیا ہے۔ٹرین ڈرائیور کی ملازمت میں عورت کو لمبے سفر کرنے پڑتے ہیں، اور اکثر اس میں محرم کی رفاقت نہیں ہوتی، جو شرعی حکم کی خلاف ورزی ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"لَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِی مَحْرَمٍ" (صحیح بخاری، حدیث:1862)

ترجمہ: عورت سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ کوئی محرم ہو۔

فقہ حنفی میں اس کی وضاحت:

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فَلَا يَحِلُّ لَهَا أَنْ تَخْرُجَ فِي السَّفَرِ بِلَا مَحْرَمٍ، لِأَنَّ فِي السَّفَرِ مَخَاطِرَ وَفِتَنًا" (بدائع الصنائع، ج2، ص334، دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: عورت کے لیے محرم کے بغیر سفر کرنا جائز نہیں، کیونکہ سفر میں خطرات اور فتنے موجود ہوتے ہیں۔

۳- عورت کی عفت و حیا اور پردہ:

اسلام نے عورت کو پردے کا حکم دیا ہے تاکہ اس کی عفت و حیا کی حفاظت ہو۔ ٹرین ڈرائیور کی ملازمت میں عورت کو ایسے لباس اور حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو شرعی پردے کے اصولوں کے خلاف ہو سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ دورانِ ملازمت اسے مردوں کے سامنے آنا پڑتا ہے، جو فتنے کا سبب بن سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ"

(سورہ الاحزاب:33)

ترجمہ: اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور قدیم جاہلیت کی طرح اپنی زیب وزینت کا اظہار نہ کرو۔

فقہائے احناف کی تصریح:

علامہ مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَخُرُوجُهَا إِلَى الْمَوَاضِعِ الْعَامَّةِ مَكْرُوهٌ إِذَا لَمْ تَكُنْ لِحَاجَةٍ"

(الھدایہ، ج1، ص197، دارالفکر)

ترجمہ: عورت کا عوامی مقامات پر نکلنا مکروہ ہے، اگر کوئی شرعی ضرورت نہ ہو۔

۴-عورت کے لیے ذمہ داری کے ساتھ فتنے کا خطرہ:

عورت کو ایسی ذمہ داری دینا جہاں مردوں کے ساتھ مکمل تعاون اور سفر درکار ہو، فتنے کے امکانات کو بڑھا دیتا ہے۔ شریعت میں ایسے امور کو ناپسند کیا گیا ہے جو عورت کی عزت وعفت کو خطرے میں ڈالیں۔

نتیجہ:

فقہ حنفی اور اسلامی شریعت کے اصولوں کی روشنی میں خواتین کا ٹرین ڈرائیور بننا جائز نہیں ہے، کیونکہ:

۱-اس میں غیر محرم مردوں کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے۔

۲-محرم کے بغیر لمبے سفر کی ضرورت پیش آتی ہے۔

۳-شرعی پردے کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

۴- فتنے اور گناہ کا اندیشہ رہتا ہے۔

لہٰذا، مسلمان خواتین کو ایسی ملازمت سے اجتناب کرنا چاہیے جو ان کی عفت، حیا اور شرعی احکام کے خلاف ہو۔

عورتوں کے لئے ٹی ٹی کی ملازمت کا حکم

سوال:(6)

ریلوے میں ایک شعبہ ٹکٹوں کی جانچ پڑتال کا ہوتا ہے، اس میں بھی خواتین کو ملازمت دی جارہی ہے، ظاہر ہے کہ ٹرین میں مسافرین کا ایک جم غفیر ہوتا ہے، اور ٹی ٹی وغیرہ کی حفاظت کے لئے سیکوریٹی گارڈ بھی ہوتے ہیں، یہ مرد اور عورتیں دونوں ہوتے ہیں، اور عام طور پر مسلح ہوتے ہیں، کیا ایسی صورت میں عورت ٹی ٹی کا فریضہ انجام دے سکتی ہے؟

جواب:(6)

خواتین کا ریلوے میں ٹکٹ چیکر(TTE) کی ملازمت اختیار کرنے کا حکم:

اسلامی تعلیمات اور فقہ حنفی کے اصول وقواعد کی روشنی میں درج ذیل شرعی نکات کی بنیاد پر واضح کیا جاتا ہے:

۱-عورت کا غیر محرم مردوں کے ساتھ اختلاط:

اسلام نے عورت کی عزت و حیا کی حفاظت کے لیے غیر محرم مردوں کے ساتھ بلا ضرورت اختلاط کو ممنوع قرار دیا ہے۔ ریلوے میں ٹکٹ چیکر کی ذمہ داری میں عورت کو مرد مسافروں کے درمیان گھومنا، بات چیت کرنا، اور بسا اوقات غیر محرم مردوں کے ساتھ آمنے سامنے ہونا پڑتا ہے، جو شرعی اصولوں کے خلاف ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وَكُلُّ مَا فِيهِ خَطَرُ الْفِتْنَةِ يَكُونُ حَرَامًا أَوْ مَكْرُوهًا عَلَى قَدْرِهِ“

(ردالمحتار علی الدر المختار، ج6، ص 371، دار الفکر)

ترجمہ: ہر وہ چیز جس میں فتنہ کا خطرہ ہو، وہ اپنی نوعیت کے مطابق حرام یا مکروہ ہوگی۔

۲-عورت کے سفرِ شرعی کے احکام:

شرعی اعتبار سے عورت کا محرم کے بغیر سفر کرنا ممنوع ہے، چاہے وہ سفر کسی بھی غرض کے لیے ہو۔ ریلوے میں TTE کے طور پر عورت کو مختلف اسٹیشنوں اور شہروں میں سفر کرنا ہوتا ہے، جو شرعی حکم کی خلاف ورزی ہے۔

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

”لَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ“ (صحیح بخاری، حدیث:1862)

ترجمہ: عورت سفر نہ کرے مگر اس کے ساتھ کوئی محرم ہو۔

۳-عورت کا عوامی مقامات پر کام کرنا اور فتنے کا اندیشہ:

ریلوے جیسے عوامی مقامات پر عورت کو ٹکٹوں کی جانچ پڑتال کے لیے مردوں کے درمیان گھومنا پڑتا ہے، جس سے حیا اور پردے کے تقاضے پورے کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ، یہ ملازمت فتنے اور غیر اخلاقی امور کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

فقہ حنفی میں بیان کیا گیا ہے:

"وَلَا يَحِلُّ لَهَا أَنْ تُبَاشِرَ الرِّجَالَ، وَلَا أَنْ يَخْتَلِطُوا بِهَا لِمَا فِي ذَلِكَ مِنَ الْفِتْنَةِ" (تفسیر قرطبی، ج14، ص228، دار الکتب المصریۃ)

ترجمہ: عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ مردوں کے ساتھ میل جول رکھے اور اختلاط کرے، کیونکہ اس میں فتنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

۴-پردے کے احکام اور شرعی تقاضے:

عورت کو شریعت میں پردے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اس کی عفت و حیا کی حفاظت ہو۔ TTE کی ملازمت میں پردے کے اصولوں کی مکمل پاسداری کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسے مردوں کے درمیان جانا پڑتا ہے، جو شرعی پردے کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ" (سورہ الاحزاب:33)

ترجمہ: اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور قدیم جاہلیت کی طرح اپنی زیب وزینت کا اظہار نہ کرو۔

۵-عورت کا اصل دائرہ کار:

شریعت نے عورت کو گھریلو ذمہ داریوں اور پردے میں رہتے ہوئے شرعی حدود میں کام کرنے کا حکم دیا ہے۔ ریلوے TTE کا کام ایک عوامی اور مردوں کے غلبے والے ماحول میں انجام پاتا ہے، جو عورت کی فطرت اور شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔

فقہ حنفی میں بیان ہے:

"وَمَكَانُهَا الْبَيْتُ فَإِنَّهُ أَحْفَظُ لَهَا وَأَصْوَنُ لِعِرْضِهَا" (تفسیر روح المعانی، ج22، ص9، دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: عورت کی جگہ اس کا گھر ہے، کیونکہ یہی اس کے لیے زیادہ محفوظ اور اس کی عزت کے لیے بہتر ہے۔

نتیجہ:

فقہ حنفی اور اسلامی شریعت کے اصولوں کی روشنی میں عورت کے لیے ریلوے میں ٹکٹ چیکر (TTE) کی ملازمت جائز نہیں ہے، کیونکہ:

۱-اس میں غیر محرم مردوں کے ساتھ اختلاط کا اندیشہ ہے۔

۲-محرم کے بغیر سفر کرنا پڑتا ہے۔

۳-شرعی پردے کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

۴-یہ فتنے اور غیر اخلاقی امور کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

لہٰذا، مسلمان خواتین کو ایسی ملازمتوں سے اجتناب کرنا چاہیے جو ان کی عفت، حیا، اور شرعی احکام کے خلاف ہوں۔

ٹکٹ کاؤنٹر کی ملازمت کا حکم

سوال:(7)

ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ کاٹنا اور ایئرپورٹ پر ٹکٹ جاری کرنے کے لئے بہت سی خاتون کارکن ہوتی ہیں، کیا اس شعبہ میں ان کا کام کرنا جائز ہے؟

جواب:(7)

خواتین کے لیے شریعتِ اسلامیہ میں جو احکام دیے گئے ہیں، وہ ان کے دینی، اخلاقی اور معاشرتی وقار کی حفاظت کرتے ہیں۔ خاص طور پر پردے کا حکم اور مخلوط مجالس سے اجتناب ضروری قرار دیا گیا ہے۔

ریلوے اسٹیشن یا ایئرپورٹ پر خواتین کا ملازمت کرنا:

ریلوے اسٹیشن یا ایئرپورٹ پر ٹکٹ کاٹنے اور جاری کرنے کا کام اگر ایسا ہو کہ:

۱-خواتین غیر محرم مردوں سے بے پردہ ہو کر معاملہ کرتی ہیں۔

۲-مخلوط مجالس میں خواتین کا رہنا لازم ہوتا ہے۔

۳-بے ضرورت گفتگو یا خلوت کا خطرہ موجود ہو۔

تو یہ صورتیں شرعی طور پر ناجائز ہوں گی کیونکہ ان میں پردے کے احکامات کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

مستند حوالہ جات:

فقہ حنفی کی معتبر کتب میں واضح کیا گیا ہے کہ:

ا-اجنبی مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط

امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"لا يحل للمرأة أن تكشف وجهها عند الأجانب إذا خِيفَت الفتنة؛ لأن ستر الوجه أكمل لها" (المبسوط للسرخسی، جلد 10، صفحہ 152، مطبع دار المعرفۃ)

ترجمہ: عورت کے لیے اجنبی مردوں کے سامنے اپنا چہرہ کھولنا حلال نہیں، خاص طور پر جب فتنے کا اندیشہ ہو؛ کیونکہ چہرہ چھپانا اس کے لیے زیادہ مکمل ہے۔

۲-عورت کے لیے غیر محرم مردوں کے ساتھ خلوت:

فقیہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

"لا یخلونّ رجل بامرأة، ولو فی قضاء حاجة، لما فیه من الفتنة" (البحر الرائق شرح کنز الدقائق، جلد 3، صفحہ 179، مطبع دار الکتب العلمیة)

ترجمہ: کسی مرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ عورت کے ساتھ خلوت میں رہے، چاہے ضرورت کے کام ہی میں کیوں نہ ہو؛ کیونکہ اس میں فتنے کا اندیشہ ہے۔

۳-اختلاط کے مفاسد:

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

"إنه لا یجوز للمرأة أن تعمل عملاً یوجب اختلاطها بالرجال الأجانب؛ لما فیه من المفاسد الظاهرة" (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، صفحہ 371، مطبع دار الفکر)

ترجمہ: عورت کے لیے ایسا کام کرنا جائز نہیں جو اس کو اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط پر مجبور کرے؛ کیونکہ اس میں واضح خرابیاں موجود ہیں۔

نتیجہ:

فقہ حنفی کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ اگر خواتین کے لیے ریلوے اسٹیشن یا ایئرپورٹ پر کام کے دوران پردے کی خلاف ورزی ہوتی ہو، اجنبی مردوں کے ساتھ

بلا ضرورت اختلاط یا خلوت پیش آتی ہو، اور ان احکام کی پاسداری ممکن نہ ہو، تو یہ ملازمت شرعاً جائز نہیں ہوگی۔

البتہ اگر کوئی ایسا انتظام ہو جہاں خواتین پردے میں رہ کر اور کسی فتنہ یا بے پردگی کے بغیر اپنے فرائض سرانجام دے سکیں، تو اس میں شرعاً گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن موجودہ دور میں اس کا اہتمام انتہائی مشکل ہے۔

علاج ومعالجہ میں کمیشن اور مقررہ تاریخ (Expiry Date) ختم ہونے کے بعد دواؤں کی فروختگی

محور اول: علاج ومعالجہ میں مروج کمیشن کا نظام:

مریض کو متعین دکان سے دوا لینے یا متعین لیبارٹی سے چیک اپ کا پابند بنانے کا حکم

سوال:(1)

مریض اور علاج کے ضرورت مندوں کو متعین جگہوں، دکان و لیبارٹری وغیرہ سے دوا لینے اور ٹیسٹ و چیک اپ کا پابند بنانا، اس وجہ سے کہ وہاں کی دوا یا چیک اپ زیادہ قابل اعتماد ہے، اس کا کیا حکم ہوگا؟ جبکہ خود اپنا کوئی فائدہ مقصود نہ ہو؛ بلکہ مریض ہی کی مصلحت پیش نظر ہو؛ اگر چہ دوا کی قیمت اور ٹیسٹ وغیرہ کی فیس دوسری جگہوں سے کسی قدر زیادہ ہو۔

جواب:(1)

مریض کو کسی خاص دکان یا لیبارٹری سے دوا یا ٹیسٹ کروانے کے لیے پابند

بنانا، جب کہ اس میں ڈاکٹر یا کسی اور کا اپنا مالی فائدہ مقصود نہ ہو بلکہ مریض کی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا کیا جائے، تو شرعاً یہ عمل جائز ہے۔ کیونکہ مریض کو صحیح علاج اور قابلِ اعتماد ذرائع سے سہولت فراہم کرنا ڈاکٹر کے فرائض میں سے ہے۔

تاہم اس کے ساتھ چند امور کی وضاحت ضروری ہے:

۱- اگر ڈاکٹر کا مقصد مریض کے حق میں بہتر علاج فراہم کرنا ہو اور اس میں خود کوئی مالی منفعت شامل نہ ہو تو یہ عمل جائز ہے۔

۲- اگر مریض کو پابند بنانے میں مریض کے حق میں کوئی حقیقی مصلحت نہیں بلکہ بلا وجہ اسے زیادہ قیمت والے ذرائع پر مجبور کیا جاتا ہے تو یہ ناجائز ہوگا۔

فقہِ حنفی کی معتبر کتب سے دلائل:

۱- ردالمحتار علی الدر المختار میں ہے:

"وَإِنَّمَا حُرِّمَ ذَلِكَ إِذَا كَانَ فِيهِ غَرَرٌ أَوْ ضَرَرٌ عَلَى الْمُكَلَّفِ"

(ردالمحتار، جلد 5، صفحہ 165، مطبع دار الفکر بیروت)

ترجمہ: یہ (پابندی یا مجبور کرنا) اس وقت حرام ہوتا ہے جب اس میں کوئی دھوکہ یا مکلّف (مریض) پر ضرر ونقصان ہو۔

۲- الفتاوی الہندیۃ میں یہ اصول بیان ہوا ہے:

"إِنْ كَانَ فِي ذَلِكَ مَصْلَحَةُ الْمُكَاتِبِ أَوِ الْمُكْرِهِ بِغَيْرِ ضَرَرٍ، فَلَا بَأْسَ بِهِ" (الفتاوی الہندیۃ، جلد 4، صفحہ 460، مطبع دار الفکر)

ترجمہ: اگر اس میں مکاتب یا کسی دوسرے کے لیے فائدہ ہو لیکن بغیر کسی ضرر کے، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

۳-البدائع الصنائع میں بھی اصولی بات ہے:

"كُلُّ مَا يَتَعَلَّقُ بِمَصْلَحَةِ الْمُسْتَحِقِّ جَائِزٌ مَا لَمْ يَكُنْ فِيهِ غَرَرٌ أَوْ ضَرَر" (بدائع الصنائع، جلد 6، صفحہ 329، مطبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)

ترجمہ: ہر وہ چیز جو کسی مستحق کی مصلحت سے متعلق ہو اور اس میں دھوکہ یا نقصان نہ ہو، وہ جائز ہے۔

خلاصہ:

اگر ڈاکٹر مریض کو کسی خاص دکان یا لیبارٹری کی طرف اس لیے رہنمائی کرے کہ وہاں کی دوا یا ٹیسٹ قابلِ اعتماد ہیں اور اس کا مقصد مریض کی صحت کو بہتر بنانا ہے، بغیر کسی ذاتی مالی مفاد کے، تو یہ جائز ہے۔ تاہم اگر اس میں مریض کو بلاوجہ مہنگی جگہ پر مجبور کیا جائے، جب کہ وہ مصلحت حقیقی نہ ہو، تو یہ ناجائز ہے۔

جس جگہ سے ڈاکٹر کو کمیشن ملتا ہو اس جگہ سے دوا خریدنے یا چیک اپ کرانے کا حکم

سوال: (2)

اپنی مصلحت سے ڈاکٹر کا متعین میڈیکل اسٹور سے دوا لینے یا لیباریٹری سے

ٹیسٹ کرانے کا پابند بنانا کیسا ہے؟ اپنی مصلحت سے مراد یہ ہے کہ وہاں سے ڈاکٹر خود مادی فوائد حاصل کرتا ہے، خواہ وہ مفت دواؤں کی شکل میں ہو یا نقد کی شکل میں بطور کمیشن ہو، یا کسی اور قیمتی تحفہ کی شکل میں۔

جواب:(2)

ڈاکٹر کا اپنے مریض کو کسی مخصوص میڈیکل اسٹور سے دوا خریدنے یا کسی خاص لیبارٹری میں ٹیسٹ کروانے کا پابند بنانا، اگر اس میں ڈاکٹر کا ذاتی مادی فائدہ شامل ہو جیسے کمیشن، نقد رقم، مفت دوا، یا تحفہ وغیرہ، تو یہ عمل شرعی طور پر ناجائز اور حرام ہے۔ کیونکہ یہ رشوت اور خیانت کے زمرے میں آتا ہے اور اس میں مریض کو غیر ضروری مالی نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں وضاحت:

ا- رشوت کا حکم:

رشوت لینا اور دینا دونوں ناجائز اور حرام ہیں، چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ"

(سنن الترمذی، باب ماجاء فی الراشی والمرتشی، حدیث: 1337)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی۔

۲-خیانت کا حکم:

مریض کو پابند بنا کر مالی فائدہ اٹھانا خیانت ہے، حالانکہ ڈاکٹر پر امانت داری لازم ہے۔فقہ حنفی کی کتاب ''الدر المختار'' میں ہے:

''وَإِذَا أَخَذَ شَيْئًا بِخِيَانَةٍ فَإِنَّهُ حَرَامٌ'' (الدر المختار، ج3،ص250،مطبعۃ بولاق)

ترجمہ:اگر کوئی شخص خیانت کے ذریعے کوئی چیز حاصل کرے تو وہ حرام ہے۔

۳-مریض کو دھوکہ دینا اور مال کمانا:

فقہاء نے دھوکہ دہی اور ناجائز طریقے سے کمائی کی سخت ممانعت کی ہے۔

''الفتاویٰ الهندیہ'' میں درج ہے:

''كُلُّ مَا فِيهِ تَغْرِيرٌ أَوْ خِيَانَةٌ أَوْ ضَرَرٌ بِالْمُسْلِمِ فَهُوَ حَرَامٌ''

(الفتاویٰ الهندیہ، ج4،ص393،دار الفکر)

ترجمہ:ہر وہ چیز جس میں دھوکہ،خیانت یا کسی مسلمان کو نقصان ہو،وہ حرام ہے۔

خلاصہ کلام:

ڈاکٹر کا اپنے مریض کو کسی مخصوص میڈیکل اسٹور یا لیبارٹری سے دوا خریدنے یا ٹیسٹ کرانے پر مجبور کرنا، جب کہ اس میں ڈاکٹر کا ذاتی مالی فائدہ ہو،شرعی طور پر ناجائز اور حرام ہے۔یہ رشوت،خیانت،اور دھوکہ دہی کے زمرے میں آتا ہے، اور ایسے عمل سے بچنا لازم ہے۔اس کے برعکس ڈاکٹر کو دیانت داری کے ساتھ مریض

کی خدمت کرنی چاہیے اور کسی قسم کے ناجائز فائدے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اگر بغیر معاہدہ کے دکاندار یا لیبارٹی والے ڈاکٹر کو کمیشن دیں تو اس کا کیا حکم ہے؟

سوال: (3)

اگر میڈیکل اسٹور، پیتھ لوجی لیب اور ڈاکٹر کے درمیان کمیشن کا کوئی طے شدہ معاملہ نہ ہو، لیکن وہ از خود بغیر کسی نظام وحساب کے آنے والے خریداروں کے اعتبار سے ہر بھیجنے والے ڈاکٹر اور اسپتال کو کچھ دیں اور میڈیکل لائن میں اس کا عرف ہو تو کیا حکم ہے؟

جواب: (3)

سوال میں ذکر کردہ صورت یعنی اگر میڈیکل اسٹور، پیتھالوجی لیب اور ڈاکٹر کے درمیان کوئی طے شدہ کمیشن نہ ہو، لیکن وہ از خود کچھ رقم دیتے ہیں اور یہ میڈیکل لائن میں عرف بن چکا ہو، تو اس معاملے کا شرعی حکم فقہ حنفی کی روشنی میں درج ذیل ہے:

مسئلے کی وضاحت:

یہ صورت حقیقت میں بغیر کسی معاہدہ اور شرط کے ہدیہ وتحفہ دینے کی ہے، لیکن چونکہ عرف عام میں یہ بات رائج ہو چکی ہے کہ لیب، میڈیکل اسٹور اور ڈاکٹر

کے درمیان یہ لین دین ہوتا ہے، اس لیے اس کے شرعی حکم پر غور ضروری ہے۔

فقہ حنفی کے اصول کی روشنی میں حکم:

فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اگر ہدیہ کسی ایسے عمل کی وجہ سے دیا جاتا ہو جس میں کسی غیر حق کو دبانے یا کسی کو نقصان پہنچانے کا احتمال ہو، یا یہ ہدیہ عرف عام کے سبب رشوت کے مترادف بن گیا ہو، تو ایسی صورت میں یہ ہدیہ لینا دینا جائز نہیں ہوگا۔

فقہ کی کتب سے دلائل:

۱- درمختار میں ہے:

"الهدية إن كانت لقضاء حاجة مهداة إليه فهو رشوة محرمة"

(الدر المختار مع رد المحتار، ج6، ص392، مطبوعہ دار الفکر)

ترجمہ: اگر ہدیہ کسی ضرورت کے کام کو انجام دینے کے لیے دیا جائے تو وہ رشوت کے زمرے میں آتا ہے، جو کہ حرام ہے۔

۲- فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"كل ما يؤدي إلى إلحاق الضرر بالغير فهو حرام، والرشوة داخلة فی ذلک لأنها تسبب ظلم الآخرين" (الفتاوی الھندیۃ، ج2، ص270، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

ترجمہ: ہر وہ چیز جو کسی دوسرے کے لیے ضرر کا باعث ہو، وہ حرام ہے، اور

رشوت اسی میں شامل ہے کیونکہ یہ دوسروں پر ظلم کا سبب بنتی ہے۔

۳-احیاء علوم الدین میں امام غزالی فرماتے ہیں:

''**فأما الرشوة فهي أن يبذل مالًا ليحكم له بما ليس له**'' (احیاء علوم الدین، ج2، ص141، مطبوعہ دار المعرفۃ)

ترجمہ: رشوت وہ مال ہے جو اس لیے دیا جاتا ہے کہ کسی ایسی چیز پر فیصلہ ہو جو اس کا حق نہیں۔

موجودہ صورت پر ان دلائل کا اطلاق:

چونکہ میڈیکل لائن میں یہ ہدیہ اور کمیشن ایک عام عرف بن چکا ہے، اور اس میں یہ احتمال ہوتا ہے کہ ڈاکٹر یا اسپتال کا عملہ مریض کو مالی فائدہ کی غرض سے کسی مخصوص لیب یا اسٹور کی طرف بھیجے، چاہے وہ مریض کے حق میں بہتر ہو یا نہ ہو۔ اس لیے یہ صورت عرفاً رشوت کے مترادف ہوگی اور شریعت میں یہ حرام قرار پائے گا۔

خلاصۂ حکم:

اگر میڈیکل اسٹور، پیتھالوجی لیب یا اسپتال از خود بغیر کسی طے شدہ معاہدے کے یہ رقم دیتے ہیں، لیکن یہ عرف عام میں رشوت کا رنگ اختیار کر چکی ہو اور اس سے لوگوں کو دھوکہ دیا جاتا ہو یا غیر ضروری مالی بوجھ مریضوں پر ڈالا جاتا ہو، تو ایسی صورت میں اس رقم کو لینا اور دینا ناجائز اور حرام ہے۔

مریض کوزیربار کرنے کے لئے ڈاکٹر کا متعینہ لیبارٹی سے چیک اپ کروانے کا حکم

سوال:(4)

ڈاکٹر کے ذریعے کسی معتبر ادارے کی ٹیسٹ وغیرہ کی رپورٹ لانے پر رپورٹ کو رد کردینا، جبکہ وہ ادارہ ڈاکٹر کا متعین کردہ نہ ہو، حالانکہ معیاری اور معتبر ہو، اور اپنی مقرر کردہ جگہ کا دوبارہ ٹیسٹ کا مکلّف بنانا کیسا ہے؟ جبکہ اس کی وجہ سے مریض زیربار ہوتا ہے؟

جواب:(4)

صورت مسئولہ میں کسی بھی معتبر اور معیاری ادارے کی میڈیکل رپورٹ کو رد کرنا جبکہ وہ ادارہ ڈاکٹر کا متعین کردہ نہ ہو، درست عمل نہیں ہے، بشرطیکہ ادارہ اپنی ساکھ اور معیار کے اعتبار سے قابل اعتماد ہو۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مریض پر بلاوجہ مشقت ڈالنا اور اس کو غیر ضروری خرچ میں مبتلا کرنا شریعت کے اصول ”لاضرر و لا ضرار“ کے خلاف ہے۔

دلائل وحوالے:

ا-فقہ حنفی کے اصول میں ایک ضابطہ:

فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ کسی بھی معاملے میں ”عرف اور عادت“ کا اعتبار

کیا جاتا ہے۔ اگر ادارہ عام طور پر معیاری، معتبر اور اپنی ساکھ رکھتا ہو تو اس کی رپورٹ کو قبول کرنا ضروری ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"المعروف کالمشروط" (ردالمحتار، جلد 4، صفحہ 431، مطبع دار الفکر بیروت)

ترجمہ: "جو چیز عرف و عادت میں معروف ہو، وہ مشروط کی حیثیت رکھتی ہے"۔

مذکورہ اصول کی روشنی میں اگر کسی معیاری اور معتبر ادارے کی رپورٹ عوام الناس کے عرف میں قابل اعتماد ہو، تو اسے رد کرنا اور اپنی مقرر کردہ جگہ کا مکلّف بنانا درست نہیں ہوگا۔

۲-مریض پر مشقت ڈالنے کی ممانعت:

شریعت کا ایک عمومی اصول ہے کہ تکلیف اور مشقت سے بچنا لازم ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وما جعل علیکم فی الدین من حرج" (سورہ حج: 78)

ترجمہ: "اور اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی"۔

امام ابن نجیمؒ "الأشباہ والنظائر" میں فرماتے ہیں:

"الأصل أن الضرر یزال" (الأشباہ والنظائر، صفحہ 75، مطبع دار الکتب العلمیۃ بیروت)

ترجمہ: "یہ ایک اصول ہے کہ نقصان کو ختم کرنا ضروری ہے"۔

مریض کو بلا وجہ دوبارہ مہنگے ٹیسٹ کا مکلّف بنانا اس اصول کے خلاف ہے کیونکہ یہ غیر ضروری طور پر نقصان اور تکلیف میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے۔

۳-اعتماد والے ذرائع کا انکار نا جائز ہے:

فقہ حنفی کی کتب میں بیان ہوا ہے کہ معتبر ذرائع اور گواہوں کی بات پر اعتماد کیا جائے گا۔ اگر کسی ادارے کی رپورٹ عمومی طور پر معتبر ہو، تو ڈاکٹر کا اسے محض اپنے مقرر کردہ ادارے کے نہ ہونے کی بنیاد پر رد کر دینا خلاف انصاف ہے۔

علامہ طاہر پٹنیؒ فرماتے ہیں:

''إذا ثبت الأمر بالبينة أو القرائن المعتادة فلا يجوز إنكاره''

(مجمع البحرین، جلد 2، صفحہ 162، مطبع دار المعارف)

ترجمہ: ''جب کوئی معاملہ معتبر گواہی یا عام قرائن سے ثابت ہو جائے، تو اس کا انکار جائز نہیں''۔

یہ اصول یہاں بھی لاگو ہوگا کیونکہ معتبر ادارے کی رپورٹ قرائن اور ساکھ کے مطابق قابل اعتماد ہے۔

خلاصہ کلام:

صورت مسئولہ میں کسی ایسے ادارے کی رپورٹ کو محض اس لیے رد کر دینا کہ وہ ڈاکٹر کا مقرر کردہ نہیں ہے، جبکہ وہ ادارہ معتبر اور معیاری ہو، یہ عمل شرعاً درست نہیں۔ مریض کو دوبارہ اپنی جگہ سے مہنگے ٹیسٹ کا مکلّف بنانا ''لا ضرر و لا ضرار'' کے

اصول اور شریعت کے عمومی احکام کے خلاف ہے۔

البتہ اگر کوئی مستند اور معقول وجہ ہو کہ رپورٹ مشکوک ہے، تب اس کا دوبارہ ٹیسٹ کروانا درست ہوگا۔

ڈاکٹر کا ضرورت سے زیادہ ٹیسٹ کروانا یا دوا لکھنے کا حکم

سوال: (5)

مریضوں کا کئی ٹیسٹ کرانا یا کئی کئی دوائیں لکھنا یا بلاضرورت ٹیسٹ لکھنا جبکہ ضرورت ایک دو ٹیسٹ یا ایک دو دواؤں کی ہو، تاکہ زیادہ سے زیادہ کمیشن حاصل ہو، اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: (5)

اگر ڈاکٹر مریضوں کو بلاضرورت اضافی ٹیسٹ کروانے یا غیر ضروری دوائیں تجویز کرنے کا عمل اس نیت سے کرتا ہے کہ زیادہ کمیشن حاصل کرے، تو یہ عمل شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ یہ خیانت، دھوکہ دہی اور ناجائز مال کمانے کے زمرے میں آتا ہے، جو اسلامی شریعت میں قطعاً ممنوع ہے۔

۱- دھوکہ دہی اور خیانت کا حکم:

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ“ (سورۃ البقرہ:188)

ترجمہ: اور اپنے مال آپس میں ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"فالآية تدل على تحريم أخذ المال بالباطل، وكل ما كان كذلك فهو حرام" (تفسیر کبیر، جلد 5، صفحہ 195، مطبع دار الفکر بیروت)

ترجمہ: یہ آیت ہر اس طریقے سے مال حاصل کرنے کی حرمت پر دلالت کرتی ہے جو ناجائز ہو، اور جو کچھ ایسا ہو، وہ حرام ہے۔

۲- کمیشن اور ناجائز مال کا مسئلہ:

فقہ حنفی میں اصول ہے کہ کسی بھی معاملے میں خیانت اور دھوکہ دہی سے حاصل کیا گیا مال حرام اور ناجائز ہوتا ہے۔ علامہ کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"لَا يَحِلُّ أَخْذُ مَالِ الْغَيْرِ بِغَيْرِ حَقٍّ، وَمَا كَانَ كَذَلِكَ فَهُوَ حَرَامٌ بِلَا خِلَافٍ" (بدائع الصنائع، جلد 6، صفحہ 155، مطبع دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: دوسرے کے مال کو ناحق طریقے سے لینا جائز نہیں، اور اس پر بلا اختلاف حرمت ثابت ہے۔

۳- غیر ضروری علاج یا ٹیسٹ تجویز کرنے کا حکم:

یہ عمل امانت کے خلاف اور دھوکہ دہی ہے، اور اس سے عوام کو غیر ضروری مالی نقصان ہوتا ہے۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے:

"مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا" (صحیح مسلم، حدیث: 101)

ترجمہ: جس نے دھوکہ دیا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"وَفِيهِ تَغْلِيظُ تَحْرِيمِ الْغِشِّ وَأَنَّهُ مِنْ خِصَالِ النِّفَاقِ" (فتح الباری، جلد 4، صفحہ 336، مطبع دار المعرفۃ)

ترجمہ: اس حدیث میں دھوکہ دہی کی حرمت کو شدید انداز میں بیان کیا گیا ہے، اور یہ نفاق کی علامتوں میں سے ہے۔

حاصلِ کلام:

مریضوں کو بلا ضرورت اضافی ٹیسٹ یا دوائیں تجویز کرنا محض کمیشن کے حصول کے لیے ایک بڑا گناہ ہے۔ یہ خیانت، دھوکہ دہی اور ناجائز مال کمانے کی حرمت پر مشتمل ہے، جس سے شریعت نے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ ڈاکٹر کو چاہیے کہ وہ امانت داری اور دیانت کے ساتھ مریضوں کا علاج کرے، کیونکہ اس کا پیشہ انسانی خدمت کا پیشہ ہے، اور اس میں خیانت کرنے پر اسے دنیا و آخرت میں جواب دہ ہونا پڑے گا۔

مترجم اور میڈیئیٹر کا کمیشن لینے کا حکم

سوال: (6)

ادھر چند سالوں سے حکومت ہند کی طرف سے میڈیکل ویزا کی سہولت

دینے کی وجہ سے دوسرے ملکوں کے مریض بڑی تعداد میں ہندوستان آرہے ہیں، جہاں انہیں مترجم و میڈیئٹر کی ضرورت پڑتی ہے، یہ مترجم اپنی پسند کے ڈاکٹر اور لیب اور دوا کی دکانوں سے دوا اور علاج و معالجہ کراتے ہیں اور دونوں طرف (مریض اور ہسپتال، لیبارٹیز اور دوا کی دکانوں) سے محنتانہ و کمیشن حاصل کرتے ہیں، البتہ دوا وعلاج کی قیمت میں اس کمیشن کی وجہ سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہے، ان صورتوں کا کیا حکم ہے؟

جواب:(6)

آپ کے سوال کا تعلق مترجم اور میڈیٹر کے ذریعے مریضوں اور اسپتالوں یا دواخانوں سے کمیشن لینے کی صورت سے ہے۔اس مسئلے کو اسلامی تعلیمات اور فقہ حنفی کی روشنی میں پرکھنا ضروری ہے تاکہ اس کا شرعی حکم واضح ہو۔

معاملے کی نوعیت:

مذکورہ صورت میں مترجم یا میڈیٹر مریضوں کو اپنی پسند کے ڈاکٹروں، لیبز اور دواخانوں پر لے جاتا ہے اور دونوں طرف (یعنی مریض اور اسپتال/ دواخانہ) سے معاوضہ یا کمیشن لیتا ہے۔البتہ اس کمیشن کی وجہ سے علاج یا دوا کی قیمت میں اضافہ نہیں ہوتا۔

شرعی حکم:

فقہ حنفی کے اصول کے مطابق کسی بھی معاملے میں کمیشن یا دلالی کی اجازت

بعض شرائط کے ساتھ دی گئی ہے، بشرطیکہ:

۱-معاملے میں دھوکہ اور فریب نہ ہو۔

۲-فریقین کو کمیشن کے بارے میں علم ہو۔

۳-کسی فریق پر غیر ضروری مالی بوجھ نہ ڈالا جائے۔

۴-دلال یا مترجم اپنا حق (محنتانہ) جائز اور مشروع طریقے سے لے۔

فقہ حنفی کے دلائل:

۱-امام محمد بن حسن الشیبانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لا بأس بأن يأخذ الرجل الأجر على الدلالة لأن الناس محتاجون إليه، فهو عمل مباح يستحق به الأجر" (المبسوط للسرخسی، جلد 15، صفحہ 115، مطبوعہ دار المعرفۃ)

ترجمہ: کسی شخص کے لیے دلالی پر اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ لوگ اس کے محتاج ہیں، یہ مباح عمل ہے جس پر اجرت لی جا سکتی ہے۔

۲-علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"الدلال هو الذى يدل المشترى على البائع، ويكون متوسطاً بينهما، ولا بأس بأخذ الأجرة على ذلك إذا لم يكن فيه غرر أو تدليس" (رد المحتار، جلد 6، صفحہ 70، مطبوعہ دار الفکر)

ترجمہ: دلال وہ ہوتا ہے جو خریدار کو بیچنے والے کی طرف رہنمائی کرے اور ان کے درمیان واسطہ بنے۔ اس پر اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ اس میں

دھوکہ یا فریب نہ ہو۔

۳- علامہ کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"الأصل أن كل عمل يجوز الانتفاع به يجوز أخذ الأجرة عليه، ما لم يكن فيه مفسدة" (بدائع الصنائع، جلد 4، صفحہ 207، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: اصول یہ ہے کہ ہر ایسا عمل جس سے نفع اٹھانا جائز ہو، اس پر اجرت لینا بھی جائز ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی فساد نہ ہو۔

موجودہ صورت پر ان دلائل کا اطلاق:

۱- چونکہ مترجم یا میڈیٹر کی خدمات مریضوں کو سہولت فراہم کرنے کے لیے ہیں، لہٰذا یہ کام جائز ہے۔

۲- اگر وہ اسپتال یا دواخانوں سے کمیشن لیتے ہیں اور مریض کو اس کا علم ہو، جبکہ دوا یا علاج کی قیمت میں اضافہ نہ ہو، تو یہ جائز ہے۔

۳- شرط یہ ہے کہ مترجم دھوکہ نہ دے، غلط معلومات نہ فراہم کرے، اور نہ ہی مریض کو کسی مالی نقصان میں مبتلا کرے۔

نتیجہ:

مذکورہ صورت میں مترجم یا میڈیٹر کے لیے دونوں طرف (مریض اور اسپتال/دواخانہ) سے محنتانہ یا کمیشن لینا جائز ہے، بشرطیکہ:

مریض اور اسپتال کو اس کمیشن کی حقیقت کا علم ہو۔

اس کمیشن کی وجہ سے علاج یا دوا کی قیمت میں اضافہ نہ ہو۔

کوئی دھوکہ دہی، فریب یا ناجائز طریقہ استعمال نہ کیا جائے۔

اگر ان شرائط کی خلاف ورزی ہو تو یہ ناجائز ہوگا۔

محور دوم : ایکسپائری تاریخ کے بعد دوا یا کسی اور سامان کی فروخت

مقررہ تاریخ کے بعد دوا فروخت کرنے کا حکم

سوال:(1)

دواؤں کے استعمال کے لیے مقررہ تاریخ کے بعد کسی دوا کے فروخت کرنے کا کیا حکم ہوگا؟

جواب:(1)

ایکسپائری تاریخ کے بعد کسی دوا یا سامان کو فروخت کرنے کا مسئلہ بنیادی طور پر شریعت کے ان اصولوں سے متعلق ہے جو بیع وشراء میں صحت وفساد اور دھوکہ دہی کے عدم جواز پر مبنی ہیں۔اس مسئلے کو تفصیل سے سمجھنے کے لیے درج ذیل نکات کا جائزہ لیا جائے گا:

1-ایکسپائری تاریخ کی شرعی حیثیت:

ایکسپائری تاریخ دوا کے مؤثر ہونے کی ضمانت کی آخری حد ہوتی ہے، جس

کے بعد کمپنی یہ ضمانت نہیں دیتی کہ دوا فائدہ پہنچائے گی یا نقصان دہ ثابت نہیں ہوگی۔ شریعت میں بیع وشراء کے لیے یہ شرط ہے کہ چیز عیب سے پاک ہو اور خریدنے والے کو دھوکہ نہ دیا جائے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"**من غش فليس منا**" (صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر:102)

(جس نے دھوکہ دیا، وہ ہم میں سے نہیں)

ایکسپائری دوا بیچنا اگر نقصان دہ ہو یا خریدار کو معلوم نہ ہو، تو یہ دھوکہ دہی میں شامل ہوگا، جو ناجائز ہے۔

۲- فقہ حنفی کی روشنی میں حکم:

فقہ حنفی میں خرید وفروخت کے لیے عیب سے پاک ہونا اور دھوکہ دہی نہ ہونا ضروری ہے۔امام کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"**البيع يجب أن يكون على أساس الرضا، ولا يجوز إذا كان فيه غش أو تدليس**" (بدائع الصنائع، ج5، ص139، مطبوعہ: دارالکتب العلمیۃ)

(بیع رضامندی پر مبنی ہونی چاہیے اور غش یا دھوکہ دہی پر مبنی ہونا جائز نہیں)

ایکسپائری دوا، اگر نقصان دہ ثابت ہو، تو اسے فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا کیونکہ یہ خریدار کے ساتھ دھوکہ دہی کے زمرے میں آتا ہے۔

۳- ایکسپائری دوا کا نقصان دہ ہونا یا نہ ہونا:

اگر ایکسپائری دوا نقصان دہ نہ ہو اور خریدار کو واضح طور پر بتایا جائے کہ یہ دوا

ایکسپائری ہوچکی ہے، تو بیع جائز ہوسکتی ہے، بشرطیکہ خریدار اپنی رضامندی سے اسے قبول کرے۔ امام ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”إذا أُخبر المشتری بعیب السلعة ورضی به، فلا بأس بالبیع“

(ردالمحتار، ج4، ص120، مطبوعہ: دارالفکر)

(جب خریدار کو عیب کے بارے میں بتادیا جائے اور وہ راضی ہوجائے تو بیع میں کوئی حرج نہیں)

۴- جدید طبی تحقیقات کا لحاظ:

جدید طب کے مطابق ایکسپائری تاریخ کے بعد دوا کے اثرات کم ہوجاتے ہیں یا بعض اوقات یہ مضر صحت ہوسکتی ہے۔ اگر دوا نقصان دہ ثابت ہو، تو اس کی فروخت شرعاً جائز نہیں ہوگی۔

حکم کا خلاصہ:

ایکسپائری دوا بیچنا ناجائز ہے، اگر:

۱- خریدار کو اس کی ایکسپائری تاریخ معلوم نہ ہو۔

۲- دوا نقصان دہ ہو۔

اگر دوا نقصان دہ نہ ہو اور خریدار کو واضح طور پر اس کی ایکسپائری تاریخ بتادی جائے اور وہ رضامند ہو تو فروخت جائز ہوسکتی ہے۔

ایکسپائر دوا کو فروخت کرنے کا حکم

سوال:(2)

اگر ایسی دوا جو ایکسپائر ہو چکی ہو بغیر بتائے بیچ دیا جائے تو کیا یہ غش میں داخل ہوگا اور حدیث من غشنا فلیس منا کے دائرہ میں آ جائے گا؟

جواب:(2)

ایکسپائر دوا کو بغیر بتائے فروخت کرنا دھوکہ دہی کے زمرے میں آتا ہے، جو اسلامی تعلیمات میں شدید ممنوع اور ناجائز ہے۔ یہ عمل حدیثِ مبارکہ **من غشّنا فلیس منا** (جس نے ہم سے دھوکہ کیا وہ ہم میں سے نہیں) کے تحت آتا ہے۔ فقہ حنفی اور دیگر فقہی کتب میں دھوکہ دہی کو سختی سے منع کیا گیا ہے، اور خریدار کو دھوکہ دینے والے کو گناہ کا مرتکب قرار دیا گیا ہے۔

فقہی دلائل:

ا- حدیث شریف:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"**من غشنا فلیس منا**" (صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر:102)

اس حدیث کی شرح میں علمائے کرام فرماتے ہیں کہ دھوکہ دہی ہر قسم میں حرام ہے، خواہ وہ مال، خدمات، یا کسی بھی لین دین سے متعلق ہو۔

۲-فقہ حنفی کی عبارات:

(الف) "الهدایه"

علامہ مرغینانیؒ لکھتے ہیں:

"کل بیع یشتمل علی الغرر والجهالة والضرر فهو باطل"

(الہدایہ، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 56، مطبع: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

ترجمہ: ہر وہ بیع جو دھوکہ، جہالت یا نقصان پر مشتمل ہو، وہ باطل ہے۔

(ب) "الدر المختار"

علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

"لا یحل للانسان ان یغش فی بیعه او یخفی عیباً" (الدرالمختار مع ردالمختار، کتاب البیوع، جلد 5، صفحہ 221، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: انسان کے لیے اپنے بیع میں دھوکہ دینا یا عیب چھپانا جائز نہیں ہے۔

(ج) "بدائع الصنائع"

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"من باع شیئاً مغشوشاً فهو غیر جائز، لأن فیه إخلال بالأمانة والتسبب فی الضرر" (بدائع الصنائع، کتاب البیوع، جلد 5، صفحہ 123، مطبع: دارالکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: جو شخص دھوکہ دہی کے ساتھ کوئی چیز فروخت کرے، اس کی بیع ناجائز ہے، کیونکہ اس میں خیانت اور نقصان کا پہلو ہے۔

خلاصہ:

ایکسپائر دوا فروخت کرنا، خاص طور پر بغیر بتائے، دھوکہ دہی ہے اور حدیث من غشنا فلیس منا کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس عمل سے نہ صرف گناہ ہوگا بلکہ بیع بھی ناجائز اور باطل ہونے کا خطرہ ہے۔ اس لیے دوا فروشوں پر لازم ہے کہ وہ مکمل دیانت داری سے کام کریں اور خریدار کو ہر چیز کے عیب اور مدت کے بارے میں واضح طور پر آگاہ کریں۔

ایکسپائر دوا سے ہونے والے منافع کا حکم

سوال: (3)

ایسی دواؤں اور چیزوں کو فروخت کر کے جو ایکسپائر ہو چکی ہو حاصل ہونے والی آمدنی اور منافع کا کیا حکم ہوگا؟

جواب: (3)

ایکسپائر شدہ دوائیں یا ایسی اشیاء جو اپنی معیاد ختم کر چکی ہوں، ان کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی اور منافع کے متعلق شریعت کا حکم واضح ہے کہ

کسی ایسی چیز کو فروخت کرنا جس کی معیاد ختم ہو چکی ہو اور جو استعمال کے قابل نہ ہو یا اس کا استعمال ضرر یا نقصان کا سبب بن سکتا ہو، نا جائز ہے۔اس کی آمدنی حرام ہوگی کیونکہ یہ دھوکہ دہی اور ضرر رسانی کے زمرے میں آتا ہے۔

دلائل:

ا-قرآن کریم:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَائَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ"

(سورۃ ہود:85)

ترجمہ:"لوگوں کو ان کی چیزوں میں کمی نہ دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ"۔

۲-حدیث شریف:

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"مَن غَشَّنا فليس منا" (صحیح مسلم،حدیث:101)

ترجمہ:"جو دھوکہ دے، وہ ہم میں سے نہیں"۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دھوکہ دہی کے ذریعے کاروبار کرنا سخت ممنوع ہے۔

۳-فقہ حنفی کی عبارات:

(الف) فتاویٰ شامی:

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ولا یجوز بیع ما فیہ ضرر علی المستهلک، سواء کان الضرر ظاهراً أو محتملاً" (ردالمحتار، ج4،ص151، مطبع دار الفکر)

ترجمہ: "ایسی چیز کی بیع جائز نہیں جس سے صارف کو نقصان پہنچے، چاہے نقصان ظاہر ہو یا محتمل"۔

(ب) بدائع الصنائع:

امام کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وإذا ظهر فی المبیع عیب یمنع الانتفاع به أو یضر به، فالبیع باطل إن کان المشتری لا یعلم به" (بدائع الصنائع، ج5،ص226، دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: "اگر مبیع میں ایسا عیب ظاہر ہو جو اس کے استعمال کو روکے یا نقصان دہ ہو اور خریدار اس سے لاعلم ہو تو بیع باطل ہے"۔

(ج) کتاب الحیل:

"إن کان فی الشیء تلف أو فساد یحرم بیعه وأکله" (کتاب الحیل، ص189، مطبع دار احیاء التراث)

ترجمہ: "اگر کسی چیز میں تلف یا فساد ہو تو اس کی بیع اور کھانا حرام ہے"۔

حکم:

ایکسپائر شدہ اشیاء کی فروخت، جب کہ بیچنے والا ان کی معیاد ختم ہونے سے واقف ہو، دھوکہ دہی اور ناجائز منافع خوری میں شمار ہوتی ہے۔ایسی آمدنی حرام ہوگی اوراس کا تدارک یہ ہے کہ حاصل شدہ مال کواصل مالک کوواپس کیا جائے۔اگر اصل مالک نہ ملےتو اسے صدقہ کردیا جائے۔

ماکولات کوایکسپائر ہونے کے بعدفروخت کرنے کاحکم

سوال:(4)

کیا دواؤں ودیگر کھانے پینے کی اشیاء میں ایسی صورت میں یعنی ایکسپائری ٹائم کے بعدفروخت کرنے کاحکم ایک ہی ہوگا یا کوئی فرق ہوگا؟

جواب:(4)

دواؤں اور دیگر کھانے پینے کی اشیاء کوایکسپائری تاریخ کے بعدفروخت کرنے کاحکم اس بات پرمنحصر ہے کہ وہ چیزیں استعمال کے قابل ہیں یانہیں۔اگر ایکسپائری تاریخ کے بعد وہ اشیاء خراب ہوچکی ہوں یاان کےاستعمال سےنقصان کا اندیشہ ہو،تو ان کا فروخت کرنا اوراستعمال کرنا دونوں ناجائز ہوں گے۔لیکن اگر ایکسپائری کے باوجودوہ اشیاء اپنی اصل حالت اورافادیت برقراررکھے ہوئے ہوں

اور ان کے استعمال سے کسی قسم کا نقصان نہ ہو، تو ان کا فروخت کرنا جائز ہوگا، لیکن خریدار کو واضح اطلاع دینا ضروری ہے۔

فقہ حنفی کے اصولی دلائل:

ا- بیع میں غرر اور ضرر کا ممنوع ہونا۔

فقہ حنفی میں ایسی بیع ممنوع ہے جس میں خریدار کو دھوکہ ہو یا وہ ضرر کا شکار ہو۔

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"وَإِنَّ كُلَّ مَا يَكُونُ جَهَالَةً مُفْضِيَةً إِلَى الْمُنَازَعَةِ تُفْسِدُ الْبَيْعَ"

(المبسوط، ج13،ص5، دار المعرفۃ)

ترجمہ: ہر وہ جہالت (گمراہی یا دھوکہ) جو نزاع کا سبب بنے، بیع کو فاسد کر دیتی ہے۔

۲- ضرر سے بچاؤ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ" (سنن ابن ماجہ، حدیث: 2340)

ترجمہ: نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ دوسرے کو نقصان پہنچاؤ۔

اس حدیث کی روشنی میں اگر ایکسپائری اشیاء کا استعمال نقصان دہ ہو، تو ان کا فروخت کرنا جائز نہیں۔

۳-خراب یا ناقص چیز بیچنا حرام ہے:

فقہ حنفی کی کتاب الہدایہ میں ہے:

"**ولا یجوز بیع ما لا منفعة فیه**" (الہدایہ، ج2،ص310،مطبع داراحیاءالتراث العربی)

ترجمہ: ایسی چیز کا بیچنا جائز نہیں جس میں کوئی منفعت نہ ہو۔

لہٰذا، اگر ایکسپائری کے بعد چیز قابلِ استعمال نہ ہو، تو اس کی بیع ناجائز ہے۔

۴-بیع میں شفافیت کی شرط:

امام ابن عابدینؒ لکھتے ہیں:

"**اَلْغِشُّ مَحْظُورٌ فِی الْبَیْعِ وَالْإِیجَارِ**" (ردالمحتار، ج5،ص238،مطبع رشیدیہ)

ترجمہ: بیع اور اجارہ میں دھوکہ دینا حرام ہے۔

اگر بیچنے والا ایکسپائری اشیاء کی حقیقت کو چھپائے تو یہ دھوکہ شمار ہوگا، جو ناجائز ہے۔

خلاصہ حکم:

۱-اگر ایکسپائری تاریخ کے بعد اشیاء خراب ہو چکی ہوں اور ان کا استعمال نقصان دہ ہو، تو ان کا فروخت کرنا اور استعمال دونوں ناجائز ہوں گے۔

۲-اگر ایکسپائری کے باوجود اشیاء خراب نہ ہوں اور ان کے نقصان دہ ہونے کا کوئی ثبوت نہ ہو، تو ان کا فروخت کرنا جائز ہوگا، بشرطیکہ خریدار کو واضح طور پر

ایکسپائری کا علم دیا جائے۔

خرید وفروخت کے لیے ضروری ہدایات:

۱-خریدار کو ایکسپائری اشیاء کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرنا واجب ہے۔

۲-خریدار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اشیاء کے معیار کی بنیاد پر فیصلہ کرے۔

۳-ایکسپائری کے بعد اشیاء کو فروخت کرنے سے پہلے ماہرین (طبی یا فوڈ ماہرین) سے ان کی افادیت کی تصدیق کرانا بہتر ہے۔

ایکسپائر دوا کے استعمال سے ہونے والے نقصان کا ضامن کون ہوگا؟

سوال:(5)

اگر ایسی دوا یا اشیاء کے استعمال کے بعد جو ایکسپائر ہو چکی ہوں کوئی نقصان سامنے آئے تو کیا اس نقصان کی ذمہ داری فروخت کنندہ پر ہوگی اور نقصان کا ضمان اس کے ذمہ ہوگا؟

جواب:(5)

ایکسپائر شدہ دوا یا اشیاء کے استعمال کے بعد اگر کوئی نقصان سامنے آئے تو

شرعی طور پر اس نقصان کی ذمہ داری فروخت کنندہ پر ہوگی، بشرطیکہ فروخت کنندہ نے اس شے کے ایکسپائر ہونے کی حقیقت خریدار سے چھپائی ہو یا دھوکہ دہی سے کام لیا ہو۔

فقہ حنفی میں ''تغریر'' (دھوکہ یا فریب دینا) اور ''تدلیس'' (عیب چھپانا) دونوں کی ممانعت ہے، اور ان کے سبب ہونے والے نقصان کی تلافی فروخت کنندہ کے ذمے ہوتی ہے۔ ذیل میں اس مسئلے کی وضاحت معتبر فقہی کتب کے حوالوں سے کی جاتی ہے:

فقہ حنفی کی مستند کتب سے دلائل:

۱۔ الدر المختار مع رد المحتار:

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

''ولو غره حتى اشترى شيئاً فاسداً أو معيباً فالخيار له، وإن هلك ضمن الغارّ ما لم يعلم المغرور'' (ردالمحتار، جلد 5، صفحہ 202، مطبع دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: اگر کسی نے دھوکہ دے کر خریدار کو خراب یا معیوب شے خریدنے پر آمادہ کیا تو خریدار کو فسخِ بیع کا حق حاصل ہوگا، اور اگر وہ شے تلف ہو گئی تو دھوکہ دینے والا ضامن ہوگا، بشرطیکہ خریدار کو عیب کا علم نہ ہو۔

۲۔ المبسوط للسرخسی:

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

''ومن باع ما لا يجوز بيعه أو غره في البيع فهلك كان الضمان على البائع'' (المبسوط، جلد 13، صفحہ 18، مطبع دار المعرفۃ، بیروت)

ترجمہ: جوشخص ایسی چیز بیچے جس کی بیع جائز نہ ہو، یا بیع میں دھوکہ دے اور وہ چیز تلف ہوجائے تو ضمان (نقصان کی تلافی) فروخت کنندہ کے ذمہ ہوگی۔

۳-بدائع الصنائع:

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"إذا دلس البائع المبيع للمشترى كان للمشترى الخيار، وإذا تلف المبيع كان البائع ضامناً" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 276، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

ترجمہ: اگر فروخت کنندہ نے خریدار کے ساتھ دھوکہ کیا تو خریدار کو اختیار ہوگا کہ وہ بیع فسخ کرے، اور اگر وہ مال تلف ہوجائے تو فروخت کنندہ ضامن ہوگا۔

مسئلے کی تطبیق:

ایکسپائر شدہ اشیاء فروخت کرنا شرعاً دھوکہ شمار ہوگا، کیونکہ ایسی اشیاء عام طور پر نقصان دہ ہوتی ہیں اور ان کے استعمال سے صحت کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ اگر فروخت کنندہ نے خریدار کو ایکسپائر ہونے کی حقیقت سے آگاہ نہیں کیا تو یہ "تدلیس" اور "تغریر" کے زمرے میں آئے گا، اور اگر اس کی وجہ سے کوئی نقصان یا بیماری لاحق ہو تو اس نقصان کی ضمان فروخت کنندہ کے ذمہ ہوگی۔

خلاصہ:

ایکسپائر اشیاء بیچنے والا اگر دھوکہ دہی کا مرتکب ہو تو نقصان کی ذمہ داری اس

پر عائد ہوگی۔خریدار کو چاہیے کہ وہ ایسی اشیاء خریدنے سے پہلے اچھی طرح جائزہ لے،اور فروخت کنندہ کو دیانتداری سے اشیاء کی حالت بیان کرنی چاہیے۔

ایکسپائرد دوایا ماکولات کو بتلا کر فروخت کرنے کا حکم

سوال:(6)

مقررہ تاریخ ختم ہونے کے بعد Expiry Date بتا کر کم قیمت پر دواؤں یا کھانے پینے کی اشیاء کو فروخت کرنا کیسا ہے؟

جواب:(6)

مقررہ تاریخ (Expiry Date) کے بعد ادویات یا کھانے پینے کی اشیاء کو کم قیمت پر فروخت کرنے کے بارے میں شرعی حکم جاننے کے لیے چند اہم اصول پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:

ا-ممنوعہ نقصان یا ضرر کا اصول:

شریعت اسلامیہ میں کوئی بھی ایسی چیز بیچنا یا استعمال کرنا جو انسان کی صحت کے لیے نقصان دہ ہو، ناجائز اور حرام ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" (سورۃ البقرہ:195)

ترجمہ:"اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو"۔

۲-فریب یا دھوکہ دہی کی ممانعت:

شریعت میں دھوکہ دینا حرام ہے، اور ایسی چیز کو بیچنا جس کا نقصان خریدار کو معلوم نہ ہو، دھوکہ شمار ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا" (صحیح مسلم: 101)

ترجمہ: "جس نے ہمیں دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں"۔

فقہ حنفی کی مستند کتب سے عبارات:

۱-بدائع الصنائع:

علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

"البيع إنما جاز لتحصيل المصلحة ودفع الضرر، فإذا كان المبيع يضر بالناس فإنه حرام بيعه لأن المقصود من التجارة دفع الضرر عن الناس وجر المنفعة إليهم" (بدائع الصنائع، ج4، ص489، مطبع دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: بیع کا جواز تو اس لیے ہے کہ لوگوں کو نفع پہنچے اور نقصان سے بچایا جائے، لہٰذا ایسی چیز بیچنا جو لوگوں کو نقصان پہنچائے، حرام ہے"۔

۲-فتاویٰ عالمگیری:

"إذا علم البائع أن السلعة تضر بالمشتری ولم يبين ذلک له فهو غشٌ وهو حرام شرعًا" (الفتاویٰ الھندیۃ، ج3، ص156، مطبع دار الفکر)

ترجمہ: اگر بیچنے والے کو معلوم ہو کہ یہ چیز خریدار کو نقصان پہنچائے گی اور وہ یہ ظاہر نہ کرے تو یہ دھوکہ ہے اور شریعت میں حرام ہے"۔

۳-ردالمحتار علی الدر المختار:

علامہ شامی فرماتے ہیں:

"یحرم بیع ما فیه ضرر بین كالطعام الفاسد والدواء المنتهی صلاحیته إلا مع بیان الضرر للمشتری" (ردالمحتار، ج6،ص391،مطبع داراحیاء التراث العربی)

ترجمہ: "ایسی چیز جس میں واضح نقصان ہو، جیسے خراب کھانے یا ایکسپائر دوائی کو بیچنا حرام ہے، الا یہ کہ خریدار کو نقصان واضح طور پر بتا دیا جائے"۔

خلاصہ حکم:

اگر دواؤں یا کھانے پینے کی اشیاء کی Expiry Date ختم ہو جائے اور وہ صحت کے لیے نقصان دہ بن چکی ہو، تو ایسی اشیاء کو فروخت کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ البتہ اگر فروخت کرنے والا خریدار کو صاف الفاظ میں نقصان یا غیر مؤثریت کے متعلق آگاہ کر دے اور خریدار اپنی ذمہ داری پر اسے خریدے، تو فروخت جائز ہے، لیکن یہ تب ہی ہوگا جب ان اشیاء کا نقصان معمولی ہو اور صحت کے لیے مہلک نہ ہو۔

مصنوعی ذہانت سے استفادہ کا مسئلہ

مصنوعی ذہانت کے استعمال کا حکم

سوال:(1)

مصنوعی ذہانت کا استعمال کرنا کیسا ہے؟ کیا اس طرح کی علمی اور معلوماتی سہولیات سے بڑھ چڑھ کر استفادہ کرنا چاہئے؟ یا اس بابت تحفظ رکھنا چاہئے؟

جواب:(1)

مصنوعی ذہانت (Artifical Intellegence) کے استعمال کا مسئلہ

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مصنوعی ذہانت (AI) کا استعمال بذات خود کوئی ممنوع یا ناجائز عمل نہیں ہے۔ اس کا استعمال اس نیت اور مقصد پر منحصر ہے جس کے لیے اسے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اگر یہ استعمال شرعی اصولوں، اخلاقی اقدار، اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے ہو تو جائز ہے، لیکن اگر اس کا استعمال نقصان دہ، غیر اخلاقی، یا خلافِ شریعت امور کے لیے کیا جائے تو یہ ناجائز اور ممنوع ہوگا۔

ا-قرآن کریم کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ"

(سورۃ الجاثیۃ:13)

ترجمہ: "اور اللہ نے تمہارے لیے زمین وآسمان کی ہر چیز کو مسخر کر دیا ہے"۔

یہ آیت انسانی ترقی کے لیے تحقیق، سائنسی دریافتوں اور ٹیکنالوجی کے استعمال کی اجازت دیتی ہے، بشرطیکہ یہ شریعت کے دائرے میں ہو۔

۲-فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہ حنفی میں اصولی قاعدہ ہے:

"الأصل في الأشياء الإباحة حتى يدل الدليل على التحريم"

(حاشیۃ ابن عابدین، جلد 1، صفحہ 210، مطبع دار الفکر)

ترجمہ: "تمام اشیاء میں اصل جواز کا حکم ہے، جب تک کہ کسی چیز کی حرمت پر دلیل قائم نہ ہو جائے"۔

مصنوعی ذہانت بھی جدید ٹیکنالوجی کی ایک شکل ہے، جس کا استعمال اس وقت تک جائز ہے جب تک کہ اس سے شریعت کی مخالفت لازم نہ آئے۔

۳-استفادہ کے حدود اور شرائط

فقہاء نے جدید ایجادات سے استفادہ کے لیے درج ذیل اصول وضع کیے ہیں:

۱-نیت کی پاکیزگی: استعمال کا مقصد اللہ کی رضا اور مخلوق کی بھلائی ہو۔

۲-حرمت سے اجتناب: اس کا استعمال ایسے مقاصد کے لیے نہ ہو جو حرام یا گناہ کا باعث ہوں۔

۳-انسانی مصلحت: اس سے انسانیت کو فائدہ پہنچانا مقصود ہو۔

۴- مثال کے طور پر اگر مصنوعی ذہانت کو اسلامی تعلیمات کی تبلیغ، قرآن وحدیث کی تشریح، یا دیگر علمی فوائد کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ جائز اور مستحسن ہے۔ لیکن اگر اسے فریب، دھوکہ دہی، یا ایسے امور کے لیے استعمال کیا جائے جو اسلامی اصولوں کے منافی ہوں، تو یہ ناجائز ہوگا۔

۵-فقہی کتب سے مزید حوالہ:

علامہ شاطبی فرماتے ہیں:

"كل مصلحةٍ معتبرة شرعاً ما لم تُفضِ إلى مفسدةٍ أعظم منها" (الموافقات، جلد 2، صفحہ 28، دار المعرفۃ)

ترجمہ: "ہر وہ مصلحت جو شرعاً معتبر ہو، جائز ہے، جب تک کہ اس سے کسی بڑے فساد کا اندیشہ نہ ہو"۔

خلاصہ:

مصنوعی ذہانت کا استعمال جائز ہے، بشرطیکہ یہ استعمال انسانی ترقی، دینی ودنیاوی فلاح، اور شریعت کی حدود میں ہو۔ مسلمانوں کو ان جدید وسائل سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے، لیکن ہمیشہ محتاط رہنا چاہیے کہ اس کا کوئی استعمال شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔

مصنوعی ذہانت کے استعمال کے اصول وضوابط

سوال:(2)

مصنوعی ذہانت کے استعمال میں تلبیس اور فراڈ کے بہت زیادہ امکانات ہیں، ساتھ ہی یہ وسائل زندگی کے لئے بہت سی آسانیاں اور افادیت بھی رکھتے ہیں، تعارفی گفتگو کو سامنے رکھ کر اس بات پر روشنی ڈالیں کہ مصنوعی ذہانت کے استعمال کے لئے کن اصول وضوابط کی پابندی شرعا ضروری ہونی چاہئے؟

جواب:(2)

مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) ایک جدید ٹیکنالوجی ہے جو انسانی زندگی میں بے پناہ سہولتیں فراہم کرتی ہے، لیکن اس کے استعمال میں دھوکہ دہی، فریب اور غیر اخلاقی سرگرمیوں کے امکانات بھی موجود ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی

میں اس کے استعمال کے لئے درج ذیل اصول وضوابط کی پابندی شرعاً ضروری ہے:

۱-نیت اور مقصد کی درستگی:

مصنوعی ذہانت کے استعمال کا بنیادی مقصد اللہ کی رضا، انسانی بھلائی اور جائز مقاصد کی تکمیل ہونا چاہیے۔کسی بھی حرام یا غیر اخلاقی مقصد کے لئے اس کا استعمال ناجائز ہوگا،جیسا کہ قرآن پاک میں فرمایا:

”وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“

(سورہ مائدہ:2)

ترجمہ: اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں مدد نہ کرو۔

۲-فراڈ اور دھوکہ دہی سے اجتناب:

مصنوعی ذہانت کے ذریعے کسی بھی قسم کی دھوکہ دہی، تلبیس یا جعل سازی سختی سے ممنوع ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا“ (صحیح مسلم:101)

ترجمہ: جو شخص دھوکہ دے، وہ ہم میں سے نہیں۔

۳-عدالت اور امانت داری:

مصنوعی ذہانت کے استعمال میں شریعت کی حدود اور انسانی حقوق کا لحاظ

ضروری ہے۔کسی کے ذاتی ڈیٹا یا معلومات کو غیر قانونی طور پر استعمال کرنا غصب اور خیانت میں شامل ہوگا، جس کی مذمت شریعت میں واضح الفاظ میں کی گئی ہے:

"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا" (سورہ نساء:58)

ترجمہ: بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ۔

۴-حرام اشیاء اور اعمال سے بچاؤ:

مصنوعی ذہانت کو کسی بھی حرام مقصد کے لئے استعمال کرنا، جیسے جوا، سود، یا غیر اخلاقی مواد کی تیاری یا ترویج، قطعی حرام ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری میں ذکر ہے:

"كُلُّ مَا يُؤَدِّي إِلَى الْحَرَامِ فَهُوَ حَرَامٌ" (الفتاویٰ الہندیہ، ج:3 ص:386، مطبع: دارالفکر)

ترجمہ: ہر وہ چیز جو حرام تک پہنچائے، وہ خود بھی حرام ہے۔

۵-شرعی مقاصد کی رعایت:

مصنوعی ذہانت کا استعمال شریعت کے مقاصد (مقاصد الشریعہ) کے مطابق ہونا چاہیے، یعنی دین، جان، عقل، نسل، اور مال کی حفاظت یقینی بنائی جائے۔ ان اصولوں کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں۔

مستند کتب سے عبارات:

۱-درمختار میں مذکور ہے:

"إِذَا كَانَ فِي التَّصَرُّفِ غَرَرٌ أَوْ خِيَانَةٌ، فَهُوَ مَمْنُوعٌ شَرْعًا"

(درمختار مع ردالمحتار، ج:4،ص:428، مطبع: دارالکتب العلمیہ)

ترجمہ: اگر کسی معاملے میں دھوکہ یا خیانت ہو، تو وہ شرعاً ممنوع ہے۔

۲-ہدایہ میں فرمایا گیا:

"الْمَقْصُودُ مِنَ الشَّرِيعَةِ دَفْعُ الضَّرَرِ وَجَلْبُ الْمَصْلَحَةِ" (ہدایہ، ج:1،ص:55، مطبع: دارالباز)

ترجمہ: شریعت کا مقصد نقصان کو روکنا اور فائدہ پہنچانا ہے۔

۳-کفایہ میں ہے:

"لَا يَجُوزُ اِسْتِخْدَامُ شَيْءٍ يُؤَدِّي إِلَى ضَرَرٍ عَامٍّ أَوْ خَاصٍّ" (کفایہ، ج:2،ص:182، مطبع: مکتبہ رشیدیہ)

ترجمہ: کسی ایسی چیز کا استعمال جائز نہیں جو عام یا خاص نقصان کا باعث ہو۔

خلاصہ:

مصنوعی ذہانت کا استعمال صرف جائز اور اخلاقی مقاصد کے لئے ہونا چاہئے۔ کسی بھی قسم کی دھوکہ دہی، حرام سرگرمیوں، یا انسانی حقوق کی خلاف ورزی سختی سے ممنوع ہے۔ یہ اصول قرآن، سنت، اور فقہ کی مستند کتب کی روشنی میں واضح ہیں۔

مصنوعی ذہانت کے ذریعہ تیار شدہ مضمون کی نسبت اپنی طرف کرنے کا حکم

سوال:(3)

مصنوعی ذہانت کے اپلی کیشن Chat GPT کے ذریعہ تیار کردہ تحریر اور کتاب کو اپنی جانب صرف اس بنیاد پر منسوب کرنا اور حق تصنیف رکھنا کیا درست کہلائے گا کہ وہ تحریر اور کتاب متعلقہ شخص نے اپنے سوالات کے ذریعہ تیار کرائی ہے؟

جواب:(3)

مصنوعی ذہانت کے اپلیکیشن جیسے Chat GPT کے ذریعہ تیار کردہ تحریر یا کتاب کو اپنی طرف منسوب کرنے اور اس کا حق تصنیف رکھنے کے متعلق شرعی حکم درج ذیل ہے:

مسئلے کی وضاحت:

جب کسی شخص نے مصنوعی ذہانت کے ذریعے کوئی تحریر یا کتاب تیار کرائی ہو تو اس میں بنیادی طور پر دو پہلو ہوتے ہیں:

ا- تحریر کی تشکیل: یعنی سوالات اور رہنمائی کے ذریعہ مواد کی تخلیق۔

۲- ملکیت: یعنی تیار شدہ مواد کو اپنی طرف منسوب کرنا اور اسے تصنیف ماننا۔

شرعی حکم:

شرعاً کسی چیز کو اپنی طرف منسوب کرنا اس وقت درست ہے جب اس کے وجود میں لانے میں شخص کا ذاتی کردار موجود ہو۔ اگر مصنوعی ذہانت کی مدد سے کسی شخص نے تحریر تخلیق کی ہے، لیکن وہ صرف سوالات کی بنیاد پر ہے اور اس نے براہ راست خود تحریر نہیں لکھی، تو ایسی صورت میں اس تحریر کو "تصنیف" کہنا اور اپنی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ یہ فعل خیانت فی النسبت کے زمرے میں آئے گا۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ" (سورۃ الإسراء، آیت: 36)

ترجمہ: "اور اس بات کی پیروی نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں"۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کسی چیز کی نسبت اپنے ساتھ کرنے کے لیے یقینی علم اور اختیار ہونا ضروری ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

ا- امانت اور خیانت کا حکم:

امانت داری ایک بنیادی اخلاقی اصول ہے۔ جو کام کسی اور کے ذریعے انجام پایا ہو، اسے اپنی طرف منسوب کرنا خیانت ہے۔

امام ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"من ادعی شیئاً لیس له فهو کاذب و غاصب" (ردالمحتار، جلد 5، صفحہ 489، مطبع دارالفکر)

ترجمہ: "جو شخص ایسی چیز کا دعویٰ کرے جو اس کی نہیں، وہ جھوٹا اور غاصب ہے"۔

۲۔تصنیف کے اصول:

تصنیف کے لیے یہ شرط ہے کہ مصنف خود تخلیقی عمل میں شامل ہو۔

علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"التصنیف یقتضی جهداً من صاحبه فی التألیف و الترتیب"

(ردالمحتار، جلد 4، صفحہ 324، مطبع دارالکتب العلمیہ)

ترجمہ: تصنیف میں مصنف کی طرف سے ترتیب و تدوین میں کوشش کا پایا جانا ضروری ہے"۔

۳۔مشترکہ مواد کی نسبت کا حکم:

اگر کسی نے دوسرے کے کام کو صرف اپنے نام سے منسوب کیا تو یہ جھوٹ اور خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔

امام مرغینانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"والکذب فی المعاملات یدخل فیه کل قول أو فعل ینسب

إلى غير صاحبه" (الہدایہ، جلد 3، صفحہ 452، مطبع دارالسلام)

ترجمہ: معاملات میں جھوٹ وہ ہے جس میں قول یا فعل کو اصل صاحب کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے"۔

۴-نتیجہ:

لہٰذا، مصنوعی ذہانت کے ذریعے تیار کردہ مواد کو اپنی طرف منسوب کرنا اس وقت جائز ہوگا جب:

۱-شخص نے مواد کو تخلیق کرنے میں براہ راست کردار ادا کیا ہو (مثلاً سوالات، ترتیب، اور تدوین)۔

۲-مواد تیار کرنے کے بعد اس میں مناسب ترمیم وتصحیح کی گئی ہو۔

۳-اصل ماخذ (مصنوعی ذہانت) کا ذکر کیا جائے۔

اگر ان شرائط کو پورا کیے بغیر صرف مواد تیار کروا کر اسے اپنی تصنیف کہنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ یہ جھوٹ اور خیانت کے زمرے میں آتا ہے۔

مصنوعی ذہانت سے اذان کا حکم

سوال: (4)

کیا مصنوعی ذہانت کا استعمال اذان کے لئے کیا جا سکتا ہے کہ مقرر کردہ نظام کے مطابق ہر وقت نماز پر خود بخود اذان انجام پاتی رہے؟

جواب:(4)

اذان ایک عظیم شعائر اسلام ہے جو نماز کے وقت کی اطلاع کے ساتھ عبادت کی دعوت کے طور پر مشروع کی گئی ہے۔اذان کی مشروعیت سنت متواترہ سے ثابت ہے،اوراس کے لیے انسان کی آواز کا استعمال سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے ۔مصنوعی اذان کے لیے ریکارڈنگ یا کسی مشین کے ذریعے اذان دینا فقہاء کرام کے نزدیک ناقص اور غیر مستحب ہے، کیونکہ اس میں اذان کے بنیادی شرعی مقاصد اور انسانی شعور وخشوع کی کمی ہوتی ہے۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے دلائل:

۱-فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"ومن شرط الاذان أن يكون بأداء الآدمي بنفسه ولا يجزئه غناء البوق والطبل وغيرهما" (فتاویٰ عالمگیری، جلد صفحہ، مطبع دار الکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: اذان کے شرائط میں سے ہے کہ اذان انسان اپنی آواز سے ادا کرے،اور بوق، ڈھول یا کسی دوسرے آلے کی آواز اذان کے لیے کافی نہیں ہوگی۔

۲-بدائع الصنائع میں امام کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"لأنه نداء لإعلام الوقت وإقامة الشعائر، فوجب أن يكون بصوت الآدمي لما فيه من التحريك والإعلام" (بدائع الصنائع، جلد 1، صفحہ 148، مطبع: دار الکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: اذان نماز کے وقت کی اطلاع اور شعائر اسلام کے قیام کے لیے ہے، لہٰذا لازم ہے کہ یہ انسانی آواز کے ذریعے ہو، تا کہ اس میں تحریک اور اطلاع کا مقصد پورا ہو۔

۳-البحر الرائق میں علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"النداء بصوت الآدمي سنة متبعة في الإقامة والأذان، فتركها إلى غيرها يخرج عن المقصود" (البحر الرائق، جلد 1، صفحہ 283، مطبع: دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: اذان اور اقامت انسانی آواز سے دینا سنت متواترہ ہے، اور اس کو کسی دوسرے ذریعہ کے سپرد کرنا مقصود سے دوری کا سبب ہے۔

خلاصہ حکم:

مصنوعی ذہانت یا ریکارڈنگ کے ذریعے اذان دینا شرعی طور پر مکروہ اور ناقص ہے، کیونکہ یہ انسانی شعور اور سنت کی اتباع کو ختم کرتا ہے۔ البتہ اگر انسانی مؤذن موجود نہ ہو اور کوئی دوسرا متبادل نہ ملے، تو وقتی طور پر یہ اجازت دی جا سکتی ہے، لیکن اس کو اصل اذان کا بدل نہیں سمجھا جا سکتا۔

فون کی آواز کا حکم

سوال: (5)

چوں کہ فون پر ایک شخص کی اپنی آواز میں اس کی نا کہی ہوئی بات بولی جا سکتی ہے

تو کیا اب فون کی آواز شرعاً معتبر مانی جاسکتی ہے؟ اور اس پر شرعی احکام مرتب ہوں گے؟

جواب: (5)

فون پر کسی کی آواز سننے کے معاملے میں شرعی اعتبار سے یہ اصول اہم ہے کہ آیا وہ آواز حقیقی طور پر سننے والے شخص کی ہے یا مصنوعی طور پر تخلیق کی گئی ہے۔ آج کل ٹیکنالوجی کے ذریعے کسی کی آواز کو نقل کر کے اسے اس کے کہے بغیر، ایسی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے کہ سننے والے کو دھوکہ ہو۔ لہذا فون پر سنی گئی آواز کے شرعی احکام کا مدار درج ذیل تفصیلات پر ہوگا:

شرعی اصول اور فقہی رہنمائی:

۱- حقیقی آواز کا اعتبار:

اگر یہ بات یقینی ہو کہ فون پر سنی گئی آواز واقعی اسی شخص کی ہے اور اس میں کسی جعل سازی کا شبہ نہیں، تو شرعی طور پر اس آواز کو معتبر مانا جائے گا، اور اس پر شرعی احکام مرتب ہوں گے، جیسے گواہی، اقرار، یا عقد وغیرہ۔

۲- مصنوعی یا مشتبہ آواز کا حکم:

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ آواز مصنوعی طور پر بنائی گئی ہے یا اس میں جعل سازی کا امکان موجود ہے، تو ایسی آواز کو شرعی طور پر معتبر نہیں مانا جائے گا، کیونکہ یقین کی

بنیاد پر احکام مرتب ہوتے ہیں، اور مشتبہ یا جعلی چیز یقین کو ختم کر دیتی ہے۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے دلائل:

۱-الدر المختار میں ہے:

"لَا يُعْتَدُّ بِشَيْءٍ فِيهِ شُبْهَةٌ فِي الصِّحَّةِ، إِذَا انْعَدَمَ الْيَقِينُ"

(الدر المختار، جلد 5، صفحہ 248، مطبع: دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: کسی ایسی چیز کا اعتبار نہیں ہوگا جس میں صحت کے متعلق شبہ ہو، کیونکہ یقین ختم ہو جائے تو حکم ثابت نہیں ہوگا۔

۲-البحر الرائق میں ہے:

"الاعتماد فی الاحکام یجب أن یکون علی ما یقطع الشک ویرفع الشبهة" (البحر الرائق، جلد 6، صفحہ 291، مطبع: دار الکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: احکام میں اعتبار اس چیز پر ہوگا جو شک کو ختم کرے اور شبہ کو دور کرے۔

۳-فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"والشهادة بما يسمع مشروطة باليقين، فإذا طرأ الشك فلاتصح" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 3، صفحہ 524، مطبع: دار الکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: جو بات سن کر گواہی دی جائے، اس کا یقین ہونا ضروری ہے، اگر شک پیدا ہو جائے تو وہ درست نہیں ہوگی۔

عصرِ حاضر کی وضاحت:

ٹیکنالوجی کی موجودہ ترقی نے آواز کی جعل سازی (voice cloning) کو ممکن بنا دیا ہے، جس سے کسی شخص کی اصل آواز اور نقل کی گئی آواز کے درمیان فرق کرنا مشکل ہوسکتا ہے۔ ایسے حالات میں:

ا- یقین کی شرط:

فون پر کسی آواز کو شرعی طور پر معتبر ماننے کے لیے ضروری ہے کہ سننے والا کسی معتبر ذریعہ سے یہ جان لے کہ یہ آواز حقیقی ہے اور اس میں جعل سازی کا کوئی امکان نہیں۔

۲- گواہی یا معاملات میں احتیاط:

فون پر آواز کے ذریعے دی گئی گواہی یا کسی معاملے کو شرعی طور پر معتبر تبھی مانا جائے گا جب آواز کی حقیقت کی تصدیق کسی ایسے ذریعہ سے ہو جو شبہ کو ختم کر دے۔

خلاصہ:

فون پر سنی گئی آواز شرعی طور پر تبھی معتبر ہوگی جب اس کی حقیقت اور صداقت کے بارے میں مکمل یقین ہو۔ اگر جعل سازی یا نقل شدہ آواز کا شبہ ہو، تو ایسی آواز پر شرعی احکام مرتب نہیں ہوں گے۔ لہٰذا، موجودہ دور میں فون کی آواز پر مبنی معاملات میں احتیاط لازم ہے، اور کسی بھی حکم کے لیے مزید تصدیق ضروری ہوگی۔

ویڈیو، آڈیو ریکارڈنگ کی قبولیت کا حکم

سوال:(6)

اگر کسی شخص سے منسوب کوئی ویڈیو یا آڈیو ریکارڈنگ ہو تو کیا اس کو شرعی ثبوت کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے؟

جواب:(6)

آج کے دور میں آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ کے ذریعے کسی شخص کے بیان یا فعل کو محفوظ کرنے کا رواج عام ہو چکا ہے۔ اس حوالے سے شرعی لحاظ سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ ریکارڈنگ ثبوت شرعی کے طور پر قابل قبول ہے یا نہیں۔ اس سوال کے جواب میں درج ذیل اصول اور تفصیلات قابل غور ہیں:

شرعی اصول:

ا-شہادت کی شرعی حیثیت:

شریعت میں گواہی کے لیے لازمی ہے کہ گواہ عاقل، بالغ، دیانت دار اور عادل ہو۔ گواہ کا قول واضح اور متعین ہو، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

"وَأَشْهِدُوا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنكُمْ" (سورۃ الطلاق:2)

ترجمہ: اور اپنے میں سے دو عادل گواہ بنالو۔

۲- آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ کا حکم:

فقہاء کرام کے نزدیک آڈیو اور ویڈیو کو بذات خود شرعی شہادت کے طور پر قبول کرنا محل نظر ہے، کیونکہ یہ غیر جاندار اور غیر ذی شعور وسائل ہیں۔ یہ محض ایک ذریعہ ہیں جو گواہی کی معاونت کر سکتے ہیں، لیکن بنیادی شہادت کے طور پر ان پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔

فقہ حنفی کی کتب سے دلائل:

۱- فتاویٰ عالمگیری:

" وَإِنَّمَا تُقْبَلُ الشَّهَادَةُ بِحَسَبِ الظَّاهِرِ، وَيُشْتَرِطُ فِيهَا الْعَدَالَةُ وَالتَّمْيِيزُ وَعَدَمُ التُّهْمَةِ" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 3، صفحہ 379، مطبع دار الفکر بیروت)

ترجمہ: شہادت کے قبول ہونے کے لیے ظاہر کا اعتبار ہے، اور اس میں عدالت، شعور اور تہمت سے پاک ہونا شرط ہے۔

۲- الدر المختار:

"الشَّهَادَةُ فِي الْأَصْلِ إِخْبَارٌ عَنْ شَيْءٍ مَاضٍ بِحَضُورٍ وَعَدَالَةٍ"

(الدر المختار، جلد 5، صفحہ 626، مطبع دار الکتب العلمیہ بیروت)

ترجمہ: شہادت دراصل ایک گزرے ہوئے واقعے کی موجودگی اور عدالت

کے ساتھ اطلاع دینے کو کہتے ہیں۔

۳-شرح مختصر الطحاوی:

"لَا يُقْبَلُ فِي الشَّهَادَةِ إِلَّا مَا تَثْبُتُ بِهِ الْعَدَالَةُ، وَمَا سِوَاهَا فَهُوَ لَيْسَ بِحُجَّةٍ شَرْعِيَّةٍ" (شرح مختصر الطحاوی، جلد 2، صفحہ 310، مطبع دار السلام ریاض)

ترجمہ: گواہی میں صرف وہی چیز معتبر ہے جس سے عدالت ثابت ہو، اور اس کے علاوہ کسی چیز کو حجت شرعیہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آڈیو و ویڈیو ریکارڈنگ کی حیثیت:

آڈیو یا ویڈیو ریکارڈنگ کو بذات خود شرعی شہادت قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ غیر ذی شعور ہیں۔ البتہ اگر اس کی تصدیق معتبر گواہوں سے کر دی جائے یا دیگر شواہد کے ساتھ اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ ضمنی طور پر شہادت کی معاونت کر سکتی ہے۔

فقہ حنفی میں گواہی کے اصولوں کو دیکھتے ہوئے آڈیو اور ویڈیو کو صرف "قرائن" (ظنی دلائل) میں شامل کیا جا سکتا ہے، جو عدالت کی مزید تحقیق کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

نتیجہ:

آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ بذات خود شرعی گواہی کے طور پر قبول نہیں کی جا سکتی۔ البتہ، اگر یہ معتبر گواہوں کی شہادت اور عدالت کے حکم کے مطابق ہو تو اسے

''معاون قرینہ'' کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مصنوعی ذہانت کے ذریعہ مفوضہ کام کی تکمیل پر اجرت کا حکم

سوال: (7)

جو اساتذہ اور مصنفین یا علمی کام انجام دینے کی نوکری کرنے والے ملازمین ہیں، وہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کی انجام دہی مثلاً مضمون اور کتاب کی تیاری، ترجمہ، ٹائپنگ، تدریس کے لئے سبق کی پلاننگ، امتحان کے سوال نامہ کی تیاری، رپورٹ کی تیاری، مفصل تحریر کی تلخیص، قانونی صلاح مشورہ کی فراہمی، وغیرہ کا کام اگر Chat GPT کے ذریعہ کم وقت میں بہ آسانی پورا کرلیں، تو کیا وہ اپنے مفوضہ کاموں کی انجام دہی کرنے والے قرار دیے جائیں گے؟ اور ان کے لئے اپنی تنخواہ یا معاوضہ وصول کرنا شرعاً درست ہوگا؟

جواب: (7)

جو اساتذہ، مصنفین یا دیگر ملازمین اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے جدید ٹیکنالوجی جیسے Chat GPT وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں، ان کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ مطلوبہ کام کو مطلوبہ معیار اور دیانت داری کے ساتھ مکمل کررہے ہیں، تو ان کے لیے شرعاً اس کام کا معاوضہ لینا جائز ہے، بشرطیکہ:

۱-ذمہ داری کی ادائیگی میں خیانت نہ ہو:

مفوضہ کام جیسے مضمون کی تیاری، ترجمہ، تدریس کے لئے سبق کی تیاری یا کسی اور قسم کا کام، اگر Chat GPT کے ذریعے کیا جارہا ہوتو اس میں معیار اور مطلوبہ تفصیلات برقرار رہیں۔ کام میں کوئی کمی یا خیانت نہ کی جائے۔

۲-ذاتی محنت اور نگرانی:

ملازم کو چاہیے کہ وہ کام کو خود دیکھے، اس کی نگرانی کرے، اور اگر ضرورت ہوتو اس میں مناسب ترامیم کرے، تاکہ اس کی محنت اور مہارت کا پہلو واضح ہو۔

۳-ممنوع امور سے اجتناب:

Chat GPT یا کسی بھی دیگر مصنوعی ذہانت کے استعمال میں، اگر کسی غیر قانونی یا غیر اخلاقی عمل (جیسے سرقہ یا Plagiraism) کا ارتکاب ہورہا ہو، تو یہ ناجائز ہوگا۔

فقہ حنفی سے دلائل:

۱-الکسب بالعمل جائزٌ بشرط الأداء بالأمانۃ والإتقان:

فقہاء نے بیان کیا ہے کہ اجرت اس وقت جائز ہوتی ہے جب اجیر (ملازم) اپنی ذمہ داری دیانت داری اور مطلوبہ معیار کے ساتھ پوری کرے۔ امام کاسانی فرماتے ہیں:

"الأجير الخاص إذا أدى عمله على الوجه المطلوب استحق

الأجر المسمی" (بدائع الصنائع، جلد 4، صفحہ 203، مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

۲-استخدام الوسائل الجدیدۃ فی العمل جائزٌ مادامت الغایۃ الشرعیۃ متحققۃ:

فقہاء نے کام میں سہولت کے لیے جائز وسائل کے استعمال کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ ان کا مقصد شریعت کے دائرے میں ہو۔ امام ابن نجیم فرماتے ہیں:

"**والأصل فی کل شیءٍ الإباحة إلا ما دل الدلیل علی تحریمه**" (البحر الرائق، جلد 7، صفحہ 321، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت)

۳-خیانت کے منع پر نصوص:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"**إذا استعمل الرجل علی العمل وهو یعلم خیانته فهو ملعون**"

(مسند احمد، حدیث نمبر 17319)

لہٰذا، اگر کوئی ملازم جدید وسائل سے کام کرے لیکن اس میں خیانت نہ کرے، تو اس کی اجرت لینا جائز ہے۔

خلاصہ:

اساتذہ، مصنفین، یا ملازمین Chat GPT یا دیگر جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کر کے اگر دیانت داری اور معیار کے ساتھ اپنا کام مکمل کرتے ہیں، تو ان کے لیے اپنی اجرت وصول کرنا جائز ہے۔ البتہ اس میں کسی قسم کی خیانت، سرقہ یا غیر اخلاقی عمل کی اجازت نہیں۔

تعلیمی ودعوتی کاموں کے لیے انٹرنیٹ سے استفادہ

ڈیجیٹل تصویر کا حکم

سوال:(1)

کیا ڈیجیٹل تصویر کا حکم بھی وہی ہے جو کاغذ یا کسی اور چیز پر نقش کی ہوئی تصویر کا ہوتا ہے؟ یا عکس کی طرح ہے؟ اور کیا ڈیجیٹل تصویر فقہی تعریف کے مطابق تصویر کے حکم میں نہیں ہے؟ اور تصویر جو ممنوع ہے وہ کونسی تصویر ہے؟

جواب:(1)

ڈیجیٹل تصویر کا حکم:

فقہ اسلامی کی رو سے تصویر کے جواز وعدم جواز کا مسئلہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ڈیجیٹل تصویر کی فقہی حیثیت کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم، یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ڈیجیٹل تصویر کو شرعی تصویر (جسے حرام کہا گیا ہے) کے زمرے میں شمار کیا جائے یا نہیں، اس کا تعلق اس تصویر کی نوعیت، مقصد، اور استعمال سے ہے۔

ڈیجیٹل تصویر: عکس یا تصویر؟

ڈیجیٹل تصویر کو اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت میں روشنی اور برقی لہروں کا مجموعہ ہے، جو کمپیوٹر یا دیگر آلات میں محفوظ ہوتی ہے۔ فقہاء کے ایک طبقے کے مطابق یہ "عکس" کے حکم میں آتی ہے، کیونکہ یہ ایک مستقل جسمانی یا مادی وجود نہیں رکھتی، جیسا کہ کاغذ پر بنی تصویر ہوتی ہے۔ جبکہ دیگر علماء اسے "تصویر" کے حکم میں شمار کرتے ہیں، کیونکہ یہ کسی فرد یا شے کی نمائندگی کرتی ہے۔

تصویر کے جواز و عدم جواز کا معیار:

اسلامی شریعت میں تصویر کی حرمت کی اصل بنیاد شرک، فحاشی، یا ایسے افعال کو فروغ دینا ہے جو اسلامی اقدار کے منافی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان تصاویر کی سختی سے ممانعت فرمائی جو جاندار کی ہو اور تعظیم کے مقصد سے بنائی جائے۔ غیر جاندار اشیاء، مناظرِ قدرت، اور دیگر ایسی چیزوں کی تصاویر کو عام طور پر جائز کہا گیا ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

۱- علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"التصوير حرامٌ إذا كانت لذوات الأرواح وعلى وجهٍ يُراد به التعظيم أو الإبتذال" (البحر الرائق، جلد 7، صفحہ 310، مطبعہ دار الکتب العلمیہ)

''تصویر اس وقت حرام ہے جب وہ جاندار کی ہو اور تعظیم یا حقارت کے لیے بنائی جائے''۔

۲-امام ابن عابدین شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''تصوير لذوات الأرواح محرمة بالإجماع، إلا ما كان خالياً عن مظنة التعظيم أو العبادة'' (ردالمحتار، جلد 6، صفحہ 373، مطبعہ دارالفکر)

''جاندار کی تصویر اجماعی طور پر حرام ہے، مگر وہ تصویر جس میں تعظیم یا عبادت کا خطرہ نہ ہو، مستثنیٰ ہے''۔

۳-علامہ طحطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''التصوير المحرم هو ما يتعلق بتصوير الجسد بتمامه على شكل يضاهي خلق الله'' (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار، جلد 4، صفحہ 209، مطبعہ داراحیاء التراث)

''حرام تصویر وہ ہے جو جاندار کے پورے جسم کو اللہ کی تخلیق کی مشابہت میں بنائے''۔

ڈیجیٹل تصویر کی فقہی تعریف:

ڈیجیٹل تصویر اپنی اصل میں محض برقی کوڈز پر مشتمل ہے، اور جب تک یہ سکرین پر نہ ہو، انسانی آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ اس بنیاد پر بعض فقہاء اسے ''عکس'' کے مشابہ قرار دیتے ہیں، کیونکہ یہ ایک عارضی چیز ہے جو مٹائی جا سکتی ہے۔ تاہم، اگر اس کا غیر شرعی استعمال کیا جائے، جیسے فحاشی یا حرام اشیاء کی تشہیر، تو یہ یقیناً ناجائز ہوگی۔

تصویر جو ممنوع ہے:

ا-وہ تصویر جو جاندار کی ہو اور تعظیم یا عبادت کے لیے بنائی جائے۔

۲-فحش تصاویر یا ایسی تصاویر جو گناہ اور معصیت کے کاموں میں معاون ہوں۔

۳-جاندار کی ایسی تصاویر جو غیر ضروری اور بلا وجہ بنائی جائیں۔

نتیجہ:

ڈیجیٹل تصویر اگر صرف عکس ہو اور اس کا مقصد جائز ہو، تو اس کے استعمال کی اجازت ہو سکتی ہے۔ تاہم، اگر اس کا استعمال غیر شرعی مقاصد کے لیے ہو، تو یہ ممنوع ہوگی۔ اس مسئلے میں احتیاط اور علماء کرام سے رجوع ضروری ہے۔

تعلیم کے لئے ریکارڈ شدہ مواد کے ویڈیو کے استعمال کا حکم

سوال:(2)

تعلیم انسان کی بنیادی ضرورت ہے، آج کل بہت سے اسکولوں اور تعلیمی اداروں میں بچوں کو اسکرین پر ریکارڈ شدہ مواد ویڈیو کی شکل میں پڑھایا جاتا ہے، جس میں آدمی، جانور اور اشیاء کی تصویریں ہوتی ہیں، کیا تعلیم کے لئے اس ذریعہ کا استعمال کیا جاسکتا ہے؟

جواب:(2)

تعلیم دینا اور لینا اسلام کی نظر میں نہایت اہم اور مطلوب عمل ہے، لیکن اس کے لیے اختیار کیے جانے والے ذرائع اور طریقوں کا جائز ہونا ضروری ہے۔ موجودہ دور میں اسکولوں اور تعلیمی اداروں میں ریکارڈ شدہ ویڈیوز کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے، جن میں انسانوں، جانوروں، اور دیگر اشیاء کی تصاویر شامل ہوتی ہیں۔ اس بارے میں فقہ حنفی اور اسلامی شریعت کی روشنی میں درج ذیل تفصیل پیش کی جاتی ہے:

فقہ حنفی میں تصویر کے احکام:

۱۔حرمتِ تصویر:

فقہ حنفی میں جاندار کی تصویر بنانا یا اسے استعمال کرنا عمومی طور پر ناجائز اور ممنوع ہے، جیسا کہ ''الدر المختار'' میں ذکر ہے:

''**تصویر کل ذی روح حرام شدید الحرمة**'' (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 6، صفحہ 474، مطبع: دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: جاندار کی ہر قسم کی تصویر سختی کے ساتھ حرام ہے۔

۲۔تعلیم کے لیے تخفیف:

لیکن اگر تصویر کا استعمال کسی ضرورت یا مصلحتِ شرعیہ کی بنیاد پر ہو، جیسے تعلیم

وتربیت، تو بعض فقہاء نے اس میں تخفیف کا پہلو بیان کیا ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"أما إن كانت الصور مما يحتاج إليها كتعليم الأطفال ومايشبه ذلك فلا بأس به" (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 6، صفحہ 475، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: اگر تصاویر ایسی ہوں جن کی ضرورت ہو، جیسے بچوں کی تعلیم یا اس سے ملتی جلتی دیگر ضروریات، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

۳- جدید وسائل کا استعمال:

شیخ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ کے بیان سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ اصل حرمت تصویر سازی میں ہے، لیکن موجودہ دور میں جو ریکارڈ شدہ ویڈیوز ہیں، یہ اصل تصویر کے حکم میں نہیں آتیں، کیونکہ یہ محض روشنی کے ذریعے عکاسی ہوتی ہے اور کوئی مستقل جسم نہیں رکھتیں۔

نتیجہ:

تعلیم کے لیے اسکرین پر ریکارڈ شدہ مواد کا استعمال، جس میں تصاویر یا ویڈیوز شامل ہوں، فقہ حنفی کی رو سے درج ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہوگا:

۱- یہ مواد جائز اور دینی و دنیاوی تعلیم کے لیے ہو، نہ کہ غیر اخلاقی یا ناجائز امور پر مشتمل ہو۔

۲-تصاویر کا استعمال صرف ضرورت تک محدود ہو۔

۳-اسکرین پر دکھائی جانے والی چیزوں میں غیر شرعی مناظر یا عقائد نہ ہوں۔

لہٰذا، بچوں کو اسکرین کے ذریعے تعلیم دینے کے لیے ویڈیوز کا استعمال ضرورت و مصلحت کی بنا پر جائز ہے، بشرطیکہ مذکورہ بالا شرائط کی پابندی کی جائے۔

تعلیم کے لئے انٹرنیٹ سے استفادہ کا حکم

سوال:(3)

دینی، دعوتی اور تعلیمی پروگرام کو انٹرنیٹ کے ذریعہ نشر کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کا کیا حکم ہے؟ کیوں کہ اس میں بولنے والے کی اور اس کے پورے ماحول کی صورت بھی منتقل کی جاتی ہے، بالخصوص تعلیم میں اگر صرف ریکارڈ سنایا جائے تو طالب علم پر وہ اثر نہیں ہوتا جو استاذ کو دیکھنے اور اس کے اشارات اور چہرہ کے نقوش کو دیکھ کر حاصل ہوتا ہے، تو کیا تعلیم کے لئے انٹرنیٹ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟

جواب:(3)

دینی، دعوتی اور تعلیمی پروگرام کو انٹرنیٹ کے ذریعے نشر کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کا حکم اسلامی شریعت میں مقصد اور حالات کے مطابق مختلف ہو سکتا ہے۔اس سوال کا جواب درج ذیل نکات کی روشنی میں دیا جا رہا ہے:

۱- دینی، دعوتی اور تعلیمی پروگرام نشر کرنے کا عمومی حکم:

دین کی دعوت کو عام کرنا، علم دین کی اشاعت کرنا، اور تعلیم وتعلم کے ذرائع کو فروغ دینا شریعت میں باعث اجر وثواب ہے، بشرطیکہ اس میں کسی قسم کی غیر شرعی بات شامل نہ ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"**وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ**" (سورۃ فصلت:33)

نیز، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"**بلغوا عنی ولو آیة**" (صحیح بخاری، حدیث:3461)

یہ دونوں دلائل اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ دعوت وتعلیم کے ہر جائز وسیلے کو اپنانا درست اور پسندیدہ ہے۔

۲- تصویر اور ویڈیو کے استعمال کا مسئلہ:

فقہائے کرام نے تصویر کی حرمت کے بارے میں تفصیل کے ساتھ احکام بیان کیے ہیں۔ اگر تصویر جاندار کی ہو اور اس کا مقصد غیر شرعی ہو تو وہ ناجائز ہے۔ تاہم، تعلیمی یا دعوتی مقاصد کے لیے ایسی صورت کا استعمال جس میں جاندار کی تصویر ہو، فقہاء کے مابین مختلف آراء کا محل ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"**ولا بأس باتخاذ ما لا روح فیه من الصور**" (رد المحتار علی الدر المختار، جلد

6،صفحہ 418، مطبع رشیدیہ، کوئٹہ)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر جاندار کی تصاویر میں نرمی ہے، لیکن جاندار کی تصویر میں احتیاط ضروری ہے۔

۳۔تعلیم کے لئے انٹرنیٹ کے استعمال کی اجازت:

تعلیم کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال ان حالات میں جائز ہے:

جب اس میں غیر شرعی امور نہ ہوں۔

استاد اور طالب علم کے درمیان حجاب اور دیگر اخلاقی آداب کا لحاظ رکھا جائے۔

براہ راست دیکھنے کی بجائے اگر صرف آواز کے ذریعے تعلیم دی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا تاکہ فتنے کے امکانات کم ہوں۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"ما يؤدي إلى الفتنة يُمنع، وما يُسَلِّم منه يجوز، حسب الحال" (فتاویٰ ہندیہ، جلد 5، صفحہ 325، مطبع نظامیہ، کانپور)

۴۔طالب علم پر براہ راست تعلیم کے اثرات:

براہ راست استاد کے سامنے بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنا بلاشبہ زیادہ مؤثر ہے، لیکن اگر اس کا حصول ممکن نہ ہو تو انٹرنیٹ کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا بھی ایک مؤثر ذریعہ ہوسکتا ہے۔

حکیم الامت تھانویؒ فرماتے ہیں:

''مقاصدِ شریعت میں آسانی پیدا کرنا اور وسائل کو بروئے کار لانا شریعت کے اصولوں کے خلاف نہیں، بشرطیکہ وہ ذریعہ شرعاً جائز ہو''۔ (اصلاحی خطبات، جلد 6، صفحہ 158، مکتبہ اشرفیہ)

نتیجہ:

دینی، دعوتی اور تعلیمی پروگرام کو انٹرنیٹ کے ذریعے نشر کرنا شریعت کی نظر میں جائز ہے، بشرطیکہ اس میں غیر شرعی امور شامل نہ ہوں اور شرعی حدود کا مکمل خیال رکھا جائے۔ تعلیم کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال بھی جائز ہے، البتہ براہ راست تعلیم کے فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے، جہاں ممکن ہو، استاد کے سامنے حاضر ہو کر تعلیم کو ترجیح دی جائے۔

دعوتی مقصد کے لئے انٹرنیٹ کے استعمال کا حکم

سوال: (4)

کیا دعوتی مقصد کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال ہوسکتا ہے؟ جب کہ باطل تحریکیں جیسے: قادیانی اور ملحدین وغیرہ اپنے مخالف اسلام نظریات کی اشاعت اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنے فاسد نظریات پہنچانے کے لئے اس کا استعمال کر رہی ہیں، اور آج مسلمانوں کا بھی ایک بڑا طبقہ ان ہی ذرائع سے علم و آگاہی حاصل کرنے کا عادی ہو چکا ہے، اور جب اس کو صحیح اور معتبر مواد نہیں ملتا تو اسلام کے نام

سے جو بھی غیر مستند معلومات نشر ہوتی ہیں، وہ ان کو دیکھتا اور ان سے متاثر ہوتا ہے۔

جواب:(4)

انٹرنیٹ کا استعمال اگرچہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مباح ہے، لیکن اس کے استعمال کا حکم نیت اور مقصد پر منحصر ہے۔ اگر انٹرنیٹ کو دعوتِ دین، اشاعتِ اسلام، حق کے غلبے، اور باطل کے رد کے لئے استعمال کیا جائے تو یہ نہ صرف جائز بلکہ باعثِ ثواب اور دین کی اہم ضرورت بن جاتا ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں حکم:

فقہاء نے ان وسائل کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے جو مباح ہوں اور ان کا مقصد دین کی خدمت ہو۔ دعوتی مقصد کے لئے ایسے ذرائع کا استعمال جن کے ذریعے اسلام کا پیغام مؤثر طریقے سے پہنچایا جا سکے، نہ صرف جائز ہے بلکہ موجودہ حالات میں واجب کے قریب ہے۔

دلیل نمبر :1

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

"وَيَجُوزُ اسْتِعْمَالُ الْوَسَائِلِ الْمُبَاحَةِ لِمَا فِيهِ نَفْعُ الْإِسْلَامِ وَتَقْوِيَتُهُ عَلَى الْبَاطِلِ" (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 6، صفحہ 371، مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: اسلام کی مدد اور باطل کے خلاف اس کو تقویت دینے کے لئے مباح

وسائل کا استعمال جائز ہے''۔

دلیل نمبر:2

امام شاطبیؒ فرماتے ہیں:

''اَلْوَسَائِلُ لَهَا أَحْكَامُ الْمَقَاصِدِ فَإِذَا كَانَ الْمَقْصُودُ شَرْعِيًّا كَانَتِ الْوَسِيلَةُ شَرْعِيَّةً'' (الموافقات، جلد 2، صفحہ 312، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت)

ترجمہ: وسائل کا حکم مقاصد کے تابع ہوتا ہے، چنانچہ اگر مقصد شرعی ہو تو وسیلہ بھی شرعی ہوگا''۔

دلیل نمبر:3

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

''اَلْعِبْرَةُ فِی الْأَفْعَالِ بِالنِّيَّاتِ وَالْمَقَاصِدِ، فَإِذَا كَانَ الْفِعْلُ يَصُبُّ فِی خِدْمَةِ الدِّينِ فَهُوَ جَائِزٌ'' (شرح مسلم، جلد 9، صفحہ 57، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: اعمال کا اعتبار نیت اور مقصد پر ہوتا ہے، لہٰذا اگر کوئی عمل دین کی خدمت کے لئے ہو تو وہ جائز ہے''۔

عصرِ حاضر میں انٹرنیٹ کا دعوتی استعمال:

آج کے دور میں انٹرنیٹ ایک مؤثر اور وسیع ذریعہ ہے جس کے ذریعے اسلام کی صحیح تعلیمات کو دنیا بھر میں پہنچایا جاسکتا ہے۔اس سے:

۱-مسلمانوں کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔

۲-اسلام کے خلاف پھیلائے جانے والے شبہات کا ازالہ ممکن ہے۔

۳-غیر مسلموں کو اسلام کے حقیقی پیغام سے روشناس کرایا جا سکتا ہے۔

۴-باطل تحریکوں جیسے قادیانیت اور الحاد کا رد کیا جا سکتا ہے۔

احتیاطی تدابیر:

۱-انٹرنیٹ کے استعمال میں وقت اور مواد کی نگرانی ضروری ہے تاکہ گناہ یا لغویات میں مبتلا نہ ہوں۔

۲-صرف مستند علماء اور معتبر اداروں کی معلومات اور مواد کو نشر کیا جائے۔

۳-غیر شرعی اور فتنہ پرور مواد سے بچاؤ کے لئے واضح حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔

لہٰذا، دعوتی مقصد کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال شرعی اصولوں کے مطابق بالکل جائز ہے اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس ذریعہ کو باطل کے مقابلے میں استعمال کریں تاکہ دینِ اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا فریضہ بخوبی انجام دیا جا سکے۔

انٹرنیٹ کے ذریعہ پروگرام کو ویڈیو کی شکل میں محفوظ کرنے کا حکم

سوال:(5)

کیا انٹرنیٹ کے ذریعہ کسی پروگرام کو ویڈیو کی شکل میں محفوظ کرنا؛ تاکہ

ضرورت مندوں کو بھیجا جا سکے، یا وقت ضرورت اس کو استعمال کیا جا سکے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے، درست ہے؟

جواب:(5)

انٹرنیٹ کے ذریعے کسی پروگرام کو ویڈیو کی شکل میں محفوظ کرنا اور پھر اسے ضرورت مندوں کو بھیجنا یا وقتِ ضرورت اس سے استفادہ کرنا، فی نفسہ جائز ہے، بشرطیکہ اس پروگرام میں کوئی غیر شرعی امور شامل نہ ہوں، مثلاً: غیر محرم خواتین کی تصاویر، موسیقی، یا دیگر ناجائز امور۔

اسلامی تعلیمات میں علمِ نافع کو عام کرنا اور دینی فوائد کو دوسروں تک پہنچانا ایک مستحسن عمل ہے۔ قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی ﷺ میں علم کو محفوظ کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی بہت ترغیب دی گئی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ" (سورۃ المائدہ:2)

ترجمہ: اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔

اسی طرح حدیث میں ہے:

"مَنْ دَلَّ عَلَى خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهِ" (صحیح مسلم، حدیث:1893)

ترجمہ: جو کسی بھلائی کی طرف رہنمائی کرے، اسے اس عمل کرنے والے کے برابر اجر ملے گا۔

فقہ حنفی کی روشنی میں جائز ہونے کی تفصیل:

فقہ حنفی کی معتبر کتب میں بھی اس بات کی صراحت ہے کہ جائز اور مباح امور کو جدید وسائل کے ذریعے انجام دینا درست ہے، بشرطیکہ وہ وسائل خود غیر شرعی نہ ہوں یا ان کا استعمال ناجائز طریقے سے نہ کیا جائے۔

حوالے:

۱- ردالمحتار علی الدر المختار میں لکھا ہے:

"الأصل فی الأشیاء الإباحة ما لم یدل دلیل علی التحریم"

(ردالمحتار، جلد 1، صفحہ 210، دار الفکر بیروت)

ترجمہ: اشیاء میں اصل اباحت ہے، جب تک کوئی دلیل تحریم پر دلالت نہ کرے۔

۲- البحر الرائق میں ہے:

"والإباحة ثابتة فی ما یعود بالنفع ولا ینافی مقاصد الشرع"

(البحر الرائق، جلد 8، صفحہ 119، دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: وہ امور جو نفع بخش ہوں اور شریعت کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں، ان کا جائز ہونا ثابت ہے۔

۳- فتاوی عالمگیری میں ہے:

"ما لم یوجد فیه منکر أو حرام فهو جائز" (فتاوی عالمگیری، جلد 5، صفحہ

335، مطبعہ دار الفکر)

ترجمہ: جب تک کسی عمل میں کوئی منکر یا حرام چیز نہ ہو، وہ جائز ہے۔

نتیجہ:

انٹرنیٹ کے ذریعے ویڈیو پروگرام محفوظ کرنے اور دینی فائدہ کے لیے اس کا استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ یہ عمل شریعت کے دائرے میں ہو۔

گوگل میٹ کو پروگرام کے لئے استعمال کرنے کا حکم

سوال: (6)

کورونا کے بعد بہت سی انتظامی؛ تجارتی اور دینی میٹنگیں زوم اور گوگل میٹ پر ہو رہی ہیں جس میں تمام شرکاء اسکرین پر موجود ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو سنتے اور دیکھتے ہیں؛ نیز اس کی پوری کاروائی کو محفوظ اور ریکارڈ بھی کیا جا سکتا ہے؛ تو اس کا کیا حکم ہے؟ کیا یہ ویڈیو گرافی کے زمرے میں آئے گا؟

جواب: (6)

زوم، گوگل میٹ، یا اسی قسم کے دیگر آن لائن پلیٹ فارمز کے ذریعے ویڈیو کانفرنسنگ کا انعقاد جدید دور کی ایک ضرورت بن چکا ہے، خاص طور پر کورونا وبا کے بعد اس کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ اس صورت میں شرکاء ایک دوسرے کو دیکھتے، سنتے

اور متعلقہ امور پر گفتگو کرتے ہیں، اور بعض اوقات ان مجالس کی ریکارڈنگ بھی کی جاتی ہے۔

فقہ حنفی اور دیگر اسلامی اصولوں کی روشنی میں اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے ویڈیو گرافی اور تصویر سازی کے حکم کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، کیونکہ ویڈیو کانفرنسنگ میں تصویر کشی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔

تصویر کشی اور ویڈیو گرافی کا حکم:

۱-فقہ حنفی کے اصول کے مطابق تصویر کشی کی ممانعت:

فقہ حنفی کی مستند کتاب الدر المختار میں بیان کیا گیا ہے:

''تصویر کا بنانا حرام ہے، چاہے وہ کسی چیز کے ساتھ ہو یا بغیر کسی چیز کے''۔

(الدر المختار، جلد 6، صفحہ 407، مطبع دار الفکر)

۲-حرمت کا سبب:

تصویر کی حرمت کا بنیادی سبب حدیث رسول ﷺ ہے، جہاں فرمایا گیا:

''إن أشد الناس عذابًا یوم القیامة المصورون'' (صحیح البخاری، حدیث: 5950، مطبع دار طوق النجاۃ)

ترجمہ: ''قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو تصویریں بناتے ہیں''۔

ویڈیو اور ڈیجیٹل تصاویر کا فرق:

ویڈیو گرافی کو بعض علماء کرام نے تصویر کشی سے مختلف قرار دیا ہے، کیونکہ ویڈیو متحرک تصاویر کا مجموعہ ہے اور اسے ایک نئی نوعیت کی چیز سمجھا جاتا ہے۔

معاصر فقہی مسائل میں علامہ مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''ویڈیو گرافی کا معاملہ عام تصویر سے مختلف ہے، کیونکہ یہ حقیقت میں تصویر نہیں بلکہ روشنی اور سائے کا انعکاس ہے، لہٰذا اسے تصویر کشی کے زمرے میں شمار کرنا درست نہیں ہوگا''۔ (معاصر فقہی مسائل، جلد 1، صفحہ 326، مطبع دارالاشاعت)

زوم اور گوگل میٹ کے استعمال کا حکم:

۱- تعلیمی، انتظامی اور دینی مقاصد کے لیے جائز:

زوم یا گوگل میٹ جیسے پلیٹ فارمز کا استعمال، بشرطیکہ وہ دینی یا مفید مقاصد کے لیے ہو اور اس میں کسی حرام یا غیر شرعی عمل کا ارتکاب نہ ہو، فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق جائز ہے، کیونکہ یہ ایک جدید ضرورت ہے اور اس میں براہِ راست تصویر کشی کا عمل شامل نہیں۔

۲- شرائط کے ساتھ ریکارڈنگ کی اجازت:

ریکارڈنگ بھی جائز ہے، بشرطیکہ وہ صرف علمی یا دینی امور کے تحفظ کے لیے ہو اور غیر ضروری اشاعت سے بچا جائے۔

نتیجہ:

زوم اور گوگل میٹ کے ذریعے آن لائن میٹنگز، تعلیمی مجالس یا دینی کانفرنسز کا انعقاد فقہ حنفی کی روشنی میں جائز ہے، بشرطیکہ:

اس کا مقصد شرعی حدود میں ہو۔

ان پلیٹ فارمز کا استعمال کسی حرام یا غیر اخلاقی مواد کے لیے نہ ہو۔

بلاضرورت ریکارڈنگ اور اشاعت سے اجتناب کیا جائے۔

ویڈیو کے نشر کے درمیان آنے والے اشتہارات کا حکم

سوال:(7)

جب پروگرام اور ویڈیو نشر ہو رہا ہوتا ہے تو درمیان میں ایسے اشتہارات بھی آتے ہیں، جو دینی اور تہذیبی اعتبار سے نا قابل قبول ہوتے ہیں، یا ایسی چیزوں کے اشتہارات ہوتے ہیں، جو شرعی اعتبار سے ممنوع ہیں، جب کہ ان اشتہارات میں ویڈیو بنانے والے کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا؛ بلکہ نشر و اشاعت کے ادارہ کی طرف سے نشر ہوتا ہے، تو اس کا حکم پر کیا اثر پڑے گا؟

جواب:(7)

ایسی ویڈیوز یا پروگرامز جن کے نشر و اشاعت کے دوران ایسے اشتہارات

دکھائے جاتے ہیں جو دینی وتہذیبی لحاظ سے غیر مناسب یا شرعی طور پر ممنوع ہیں، ان کے بارے میں بنیادی حکم یہ ہے کہ ویڈیو بنانے والے یا اس کے نشر واشاعت میں حصہ لینے والے کی ذمہ داری ان اشتہارات پر اس وقت عائد ہوگی جب وہ ان اشتہارات کی نشر واشاعت میں براہ راست یا بالواسطہ کوئی تعاون کرے یا ان کا حصہ ہو۔

اگر ویڈیو یا پروگرام میں ایسی چیز شامل نہیں کی گئی ہو جو شرعی لحاظ سے ناجائز ہو، اور اشتہارات مکمل طور پر نشر واشاعت کے ادارے کی طرف سے شامل کیے گئے ہوں، تو ویڈیو بنانے والے کو ان اشتہارات کے گناہ میں شریک نہیں کہا جائے گا، کیونکہ "کلّ نفس بما کسبت رھینة" (ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہے)۔

فقہ حنفی کی مستند کتب سے دلائل:

۱- الدر المختار مع رد المحتار میں ہے:

"وَإِذَا تَخَلَّلَ فِی الْمُبَاحِ مَا لَا یَمْلِکُهُ فَعَلَیْهِ الْوُقُوفُ عِنْدَ الْحُدُودِ، لَا مَا زَادَ عَلَی ذَلِکَ" (رد المحتار علی الدر المختار، دار الفکر، جلد 5، صفحہ 294)

یعنی جب کسی مباح عمل میں ایسی چیز شامل ہو جائے جس پر اختیار نہ ہو، تو آدمی کی ذمہ داری حد تک محدود ہوگی، اور اس پر زائد کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

۲- بدائع الصنائع میں ہے:

"لَا یُؤَاخَذُ الْإِنسَانُ إِلَّا بِمَا صَدَرَ عَنْهُ بِاخْتِیَارِهِ وَعَمَلِهِ" (بدائع الصنائع، دار الکتب العلمیة، جلد 6، صفحہ 140)

یعنی انسان کو صرف اسی عمل پر مؤاخذہ ہوگا جو اس نے اپنی مرضی اور عمل سے

انجام دیا ہو۔

۳-البحر الرائق میں ذکر کیا گیا ہے:

"مَا تَسَبَّبَ إِلَى الْحَرَامِ بِفِعْلٍ أَوْ قَوْلٍ عَمَدًا يُؤَاخَذُ بِهِ، وَإِذَا لَمْ يَكُنْ لَهُ تَسَبُّبٌ، لَا ذَنْبَ عَلَيْهِ" (البحر الرائق، دارالکتب العلمیۃ، جلد 4، صفحہ 221)

یعنی اگر کسی نے جان بوجھ کر کسی حرام چیز کا سبب فراہم کیا ہو تو وہ گناہگار ہوگا، اور اگر اس کا کوئی سبب نہ ہو، تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

خلاصہ:

اگر ویڈیو بنانے والے کا ان اشتہارات کی اشاعت میں کوئی اختیار یا عمل دخل نہیں ہے اور وہ ان اشتہارات کے مواد سے لاعلم ہے، تو اس پر ان اشتہارات کے گناہ کی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔ تاہم، بہتر یہ ہے کہ وہ ایسے پلیٹ فارمز یا اداروں کے ساتھ کام کرنے سے گریز کرے جہاں اس طرح کے اشتہارات نشر ہونے کا غالب گمان ہو، تاکہ تقویٰ اور احتیاط کے پہلو کو مدنظر رکھا جا سکے۔

ٹی وی اسکرین لگانے کا حکم

سوال:(8)

آج کل بسا اوقات ٹی وی اسکرین لگائے جاتے ہیں؛ تاکہ دور تک موجود سامعین اسٹیج کو دیکھ سکیں اور پروگرام سننے میں ان کو یکسوئی ہو، تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:(8)

آج کل عوامی اجتماعات اور دینی پروگراموں میں سامعین کو سہولت فراہم کرنے کے لیے بڑی اسکرینز اور دیگر تکنیکی وسائل کا استعمال عام ہوگیا ہے، تاکہ سامعین دور ہونے کے باوجود اسٹیج کو دیکھ سکیں اور مقرر کی بات سننے میں یکسوئی پیدا ہو۔ شرعی نقطۂ نظر سے اس معاملے کو درج ذیل اصولوں اور تفصیلات کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے:

شرعی اصول:

۱-مقصدِ شریعت کی رعایت:

اسلام نے ہر ایسے ذریعہ کو جائز رکھا ہے جو حلال اور جائز مقصد کے لیے استعمال ہو، بشرطیکہ اس میں کوئی ناجائز یا غیر شرعی امر شامل نہ ہو۔

۲-وسائل کے حکم کا مدار ان کے استعمال پر:

وسائل بذات خود مباح ہیں، ان کے استعمال کا حکم اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کس مقصد کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔

۳-تصاویر اور ویڈیو کی شرعی حیثیت:

تصویر یا ویڈیو کو فی زمانہ متعدد فقہاء نے اختلافی مسئلہ قرار دیا ہے۔ اگر ان کا

استعمال دینی یا تعلیمی مقاصد کے لیے ہو اور اس میں کسی غیر شرعی عمل کا اندیشہ نہ ہو، تو اس کے جواز کی گنجائش نکلتی ہے۔

فقہ حنفی کی کتب سے دلائل:

۱- حاجت کے وقت آلات کا استعمال:

فقہ حنفی میں حاجت اور ضرورت کے وقت آلات کے استعمال کی گنجائش دی گئی ہے، جیسا کہ ردالمحتار میں ہے:

"**الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة**" (ردالمحتار، جلد 6، صفحہ 738، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: حاجت کو عام یا خاص صورت میں ضرورت کے درجے میں رکھا جائے گا۔

۲- مباح وسائل کا جواز:

الدرالمختار میں آیا ہے:

"**الأصل في الوسائل الإباحة، ما لم يتحقق المنع**" (الدرالمختار، جلد 1، صفحہ 460، مطبع: دارالکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: اصول یہ ہے کہ وسائل اپنی اصل میں مباح ہیں، جب تک کسی ممنوع چیز کا تحقق نہ ہو۔

۳-اجتماعات میں سہولت کے وسائل:

اجتماعات میں آواز پہنچانے کے لیے مائیک یا اسپیکر استعمال کرنا فی زمانہ مقبول اور جائز ہے، جیسا کہ فتاویٰ شامی میں اس قسم کے آلات کے جواز کی طرف اشارہ ملتا ہے:

"کل ما کان معیناً علی الطاعة ومحققا للغرض المشروع، فھو جائز" (فتاویٰ شامی، جلد 5، صفحہ 341، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: ہر وہ چیز جو عبادت یا جائز مقصد میں معاون ہو، وہ جائز ہے۔

موجودہ دور میں اسکرینز کا استعمال:

ٹی وی اسکرین یا پروجیکٹر استعمال کرنے میں چند شرائط کا لحاظ ضروری ہے:

۱-غیر شرعی مناظر سے اجتناب:

اگر اسکرین پر ایسی چیزیں دکھائی جائیں جو شرعاً ناجائز ہوں (مثلاً غیر محرم خواتین کی تصاویر یا موسیقی)، تو اس کا استعمال ناجائز ہوگا۔

۲-دینی و تعلیمی مقاصد:

اگر اسکرین دینی اجتماعات، تعلیم و تدریس یا عوام کی سہولت کے لیے استعمال کی جائے، تو یہ شرعی لحاظ سے جائز ہوگا۔

۳-تشبہ بالکفار سے بچنا:

اس بات کا خیال رکھا جائے کہ استعمال خالص دینی اور اصلاحی ہو، اور اس میں کفار یا فساق کی مشابہت نہ ہو۔

خلاصہ حکم:

اجتماعات میں ٹی وی اسکرین یا پروجیکٹر استعمال کرنا شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ اس کا مقصد دینی تعلیم، تبلیغ، یا اصلاح ہو اور اس میں کوئی غیر شرعی پہلو شامل نہ ہو۔ یہ وسیلہ مقاصد کے حصول میں معاون ہو سکتا ہے اور اس کا استعمال حالات کے مطابق ایک مباح طریقہ ہے۔

جلسوں میں خواتین کے لئے ٹی وی اسکرین لگانے کا حکم

سوال:(9)

اس طرح کے اسکرین جلسہ گاہ کے ان حصوں میں بھی استعمال کئے جاتے ہیں، جہاں خواتین کی نشست ہوتی ہے، تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب:(9)

خواتین کے لیے ایسی جلسہ گاہوں میں اسکرین کے ذریعے پروگرام دیکھنے یا

سننے کا مسئلہ اسلامی پردہ اور عفت وحیا کے احکام کے تابع ہے۔ خواتین کے لیے جلسے میں شرکت اور اسکرین کے استعمال کا جواز اور عدم جواز ان شرائط اور اصولوں پر منحصر ہوگا جنہیں اسلامی شریعت نے مقرر کیا ہے۔

شرعی اصول:

۱- پردہ کا حکم:

شریعت نے عورتوں کے لیے پردے کو لازم قرار دیا ہے اور غیر محرم مردوں کے ساتھ اختلاط یا ایسی صورت حال سے بچنے کا حکم دیا ہے جو فتنے کا ذریعہ بنے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ''

(سورۃ الأحزاب:33)

ترجمہ: اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور قدیم جاہلیت کی طرح اپنی زینت کو ظاہر نہ کرو۔

۲- آواز کا پردہ:

عورت کی آواز کا پردہ خود ضروری نہیں، مگر اس کو سننے کے موقع پر غیر محرم مردوں کے فتنے کا اندیشہ ہو، تو شریعت اس سے بھی احتراز کا حکم دیتی ہے۔

۳- اختلاط سے بچاؤ:

اجتماعات میں خواتین کی نشست مردوں سے مکمل علیحدہ ہو اور ایسی کوئی

صورت نہ ہو جس سے براہِ راست یا بالواسطہ اختلاط ہو۔

فقہ حنفی کی کتب سے دلائل:

۱-درمختار میں عورت کے پردے کے بارے میں ہے:

"وَيَجِبُ عَلَيْهِنَّ السَّتْرُ وَتَرْكُ كُلِّ مَا يُؤَدِّي إِلَى الْفِتْنَةِ" (درمختار مع ردالمحتار، جلد6، صفحہ 367، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: عورتوں پر پردہ اور ہر اس چیز کو ترک کرنا واجب ہے جو فتنے کا باعث بنے۔

۲-البحر الرائق میں ذکر ہے:

"**النظر إلى النساء الأجنبيات سبب الفتنة، فوجب اجتنابه ما أمكن**" (البحر الرائق، جلد8، صفحہ 219، مطبع: دارالکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: غیر محرم عورتوں کو دیکھنا فتنہ کا سبب ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو اس سے بچنا واجب ہے۔

۳-فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"**ولا يحل النظر إلى المرأة ولو من وراء حجاب إذا كان فيه خوف الفتنة**" (فتاویٰ عالمگیری، جلد5، صفحہ 329، مطبع: دارالکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: کسی عورت کو پردے کے پیچھے سے بھی دیکھنا جائز نہیں، اگر فتنے کا اندیشہ ہو۔

اسکرین کے استعمال کا حکم خواتین کے لیے:

۱- جواز کی شرائط:

اگر اسکرین پر صرف خواتین کے لیے مخصوص حصہ ہو، اور مردوں کی شرکت یا ان کی نظریں اس پر نہ پڑیں۔

خواتین کے لیے علیحدہ نشست کا اہتمام ہو اور مکمل پردے کا خیال رکھا جائے۔

اسکرین پر صرف خواتین کے فائدے کے لیے دینی یا اصلاحی مواد پیش کیا جائے۔

۲- عدم جواز کی صورت:

اگر اسکرین پر مرد مقررین کو براہ راست دکھایا جائے، کیونکہ غیر محرم مرد کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔

اگر اسکرین پر ایسا مواد دکھایا جائے جو فتنے کا باعث بن سکتا ہو یا اس سے خواتین کے حجاب میں کمی آئے۔

اگر اس سے خواتین اور مردوں کے درمیان بالواسطہ اختلاط کا اندیشہ ہو۔

خلاصہ حکم:

خواتین کے لیے جلسہ گاہ میں اسکرین کا استعمال اس وقت جائز ہے جب مکمل شرعی پردے کا اہتمام کیا جائے، اسکرین صرف خواتین کے دائرے میں محدود

ہو، اور اس پر صرف دینی و تعلیمی مواد پیش کیا جائے۔لیکن اگر اس سے پردہ یا حیا کے اصولوں کی خلاف ورزی ہو یا فتنے کا خدشہ ہو، تو اس کا استعمال جائز نہیں ہوگا۔

تصویر والی چیز کے خریدنے کا حکم

سوال:(10)

جو تصویر کسی چیز پر نقش ہو، اور دائمی طور پر برقرار ہو، اس کی ممانعت پر علماء امت کا اتفاق ہے، لیکن اگر اسی نوعیت کی تصویر والی شئی کے استعمال میں تصویر مقصود نہ ہو؛ بلکہ خود وہ شئی مقصود ہو، یا تصویر والی اشیاء تصویر کے لئے نہیں ؛ بلکہ ضرورت کی چیز ہونے کی وجہ سے خریدی جائے ؛ جیسے: اخبارات اور طب ولغت وغیرہ کی کتابیں، تو ایسی اشیاء کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہوگا ؟

جواب:(10)

تصاویر کے مسئلے میں شریعت اسلامی نے اس کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے، اور فقہاء نے تصاویر کی ممانعت اور اس کے استعمال کے جواز یا عدم جواز کے حوالے سے کئی اصول اور تفصیلات بیان کی ہیں۔سوال میں بیان کردہ صورت، جہاں تصویر کسی شے پر نقش ہو اور خود تصویر مقصود نہ ہو، بلکہ وہ چیز مقصود ہو، جیسے اخبارات، تعلیمی کتابیں یا دیگر ضروری اشیاء، تو ایسی اشیاء کی خرید وفروخت کے جواز کا حکم درج ذیل تفصیلات کی روشنی میں بیان کیا جاتا ہے:

شرعی اصول:

۱-تصویر کی ممانعت کا سبب:

تصویر کی حرمت کی بنیادی وجہ اس کا احترام اور تعظیم ہے، جیسا کہ مجسمے یا ایسی تصاویر جو عبادت یا غیر شرعی مقاصد کے لیے استعمال ہوں۔

حدیث میں ہے:

"إن أشد الناس عذاباً يوم القيامة المصورون" (صحیح بخاری، حدیث نمبر: 5954، صحیح مسلم، حدیث نمبر: 2109)

ترجمہ: قیامت کے دن سب سے سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو تصویریں بناتے ہیں۔

۲-تصویر کے استعمال کا مقصد:

اگر تصویر کسی شے پر دائمی طور پر نقش ہو لیکن اس کا مقصد تعظیم یا غیر شرعی استعمال نہ ہو، بلکہ وہ شے بذات خود مقصود ہو، تو اس کے جواز کی گنجائش فقہاء کے کلام سے نکلتی ہے۔

۳-ضرورت اور حاجت کا اصول:

فقہ حنفی میں ضرورت یا حاجت کے وقت تصویر کی موجودگی کو معاف قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی تعظیم یا فتنے کا پہلو نہ ہو۔

فقہ حنفی کی کتب سے دلائل:

۱-الدرالمختار میں ہے:

"تکره الصورة على الشيء الممتهن، كالبساط والوسادة، أما على غير الممتهن فحرام" (الدرالمختار مع ردالمحتار، جلد6، صفحہ 418، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: تصویر کسی ایسی چیز پر جو پامال ہو (جیسے قالین یا تکیہ)، اس کا استعمال مکروہ ہے، لیکن کسی معزز چیز پر تصویر کا ہونا حرام ہے۔

۲-فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"إذا كانت الصورة في موضع يُستعمل للضرورة أو للحاجة، ولم تكن للتعظيم، يجوز استعمالها" (فتاویٰ عالمگیری، جلد5، صفحہ 441، مطبع: دارالکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: اگر تصویر کسی ایسی جگہ ہو جو ضرورت یا حاجت کے لیے استعمال ہوتی ہو اور تعظیم کا پہلو نہ ہو، تو اس کا استعمال جائز ہے۔

۳-بدائع الصنائع میں ہے:

"ويجوز بيع الشيء المصور إذا لم تكن الصورة مقصودة ولا محترمة" (بدائع الصنائع، جلد5، صفحہ 117، مطبع: دارالکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: ایسی شے کی خرید وفروخت جائز ہے جس پر تصویر ہو، بشرطیکہ تصویر مقصود نہ ہو اور نہ ہی اس کی تعظیم کی جارہی ہو۔

موجودہ دور کے اطلاقات:

۱-اخبارات اور کتابیں:

اخبارات اور تعلیمی کتابوں پر موجود تصاویر مقصود نہیں ہوتیں، بلکہ اصل مقصد معلومات یا علم کا حصول ہوتا ہے۔لہذا ان کا استعمال اور خرید وفروخت جائز ہے۔

۲-ضروری اشیاء:

اگر کسی ضروری چیز پر تصویر موجود ہو اور اس کی خرید وفروخت تصویر کے لیے نہ ہو، تو اس کے جواز میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ اس تصویر سے فتنے یا غیر شرعی استعمال کا خدشہ نہ ہو۔

۳-تصویر والی اشیاء کی تعظیم کا پہلو:

ایسی اشیاء جو تصویریں لیے ہوئے ہوں لیکن ان کی تعظیم یا شرعی حرمت کی خلاف ورزی نہ ہو، مثلاً طب کی کتابیں، لغات یا دیگر سائنسی و تعلیمی مواد، ان کا استعمال جائز ہوگا۔

خلاصہ حکم:

تصویر اگر کسی شے پر دائمی طور پر موجود ہو لیکن وہ تصویر مقصود نہ ہو، بلکہ وہ شے بذات خود مقصود ہو، اور اس کا استعمال تعلیمی، معلوماتی یا ضرورت کے لیے ہو، تو ایسی اشیاء کی خرید وفروخت جائز ہے۔تا ہم، ان اشیاء کے استعمال میں بھی احتیاط لازم ہے کہ تصویر کو غیر ضروری تعظیم یا فتنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

نصابِ زکاۃ کے معیار اور ضمِ نصاب کے مسئلے سے متعلق چند سوالات

زکوۃ، قربانی، صدقۂ فطر کے وجوب کے لئے اصل نصاب سونا ہے یا چاندی؟

سوال:(1)

سونے چاندی پر زکوۃ کے وجوب کے لئے دونوں کی الگ الگ مقدار منصوص ہے، ان دونوں نصابوں میں اصل کون ہے؟ سونے کا نصاب؟ یا چاندی کا نصاب؟یا دونوں؟

مرورِ زمانہ سے دونوں نصابوں کی مالیت میں مساوات ختم ہو جانے کی وجہ سے کیا اب سونے کی مالیت کواصل قرار دے کر چاندی کے نصاب کواس کے تابع قرار دیا جا سکتا ہے؟ یعنی جب تک چاندی سونے کے نصاب کی قیمت کو نہ پہنچ جائے اس وقت تک زکوۃ، قربانی اور صدقہ فطر واجب نہ ہو؟ اگر جواب اثبات میں ہوتو سونے کے نصاب کواصل قرار دینے کی شرعی بنیاد کیا ہوگی؟

جواب:(1)

سونے اور چاندی پر زکوۃ کے وجوب کے لئے شریعت نے الگ الگ نصاب مقرر فرمایا ہے:

سونے کا نصاب:(20 دینار87.48 گرام یا 7.5تولے)

چاندی کا نصاب:(200درہم612.36 گرام یا52.5تولے)

سونے اور چاندی میں اصل نصاب کون سا ہے؟

فقہاء کے ہاں سونے اور چاندی دونوں کوالگ الگ نصاب کے طور پر قبول کیا گیا ہے، اوران میں کسی ایک کودوسرے پر اصل قرار دینا نصوصِ شرعیہ کے خلاف ہوگا۔دونوں اصل ہیں اور کسی ایک کودوسرے کے تابع قرار دینا درست نہیں، جیسا کہ حدیثِ مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے دونوں نصاب الگ الگ بیان فرمائے ہیں:

"عن علی رضی الله عنه أن النبی صلی الله علیه وسلم قال: "لیس فی أقل من عشرین مثقالا من الذهب ولا فی أقل من مائتی درهم من الورق صدقة" (سنن أبي داود، کتاب الزکاۃ، حدیث:1573)

مرورِ زمانہ اور مالیت میں تفاوت:

زمانہ گزرنے کے ساتھ سونے اور چاندی کی مالیت میں فرق آ گیا ہے، لیکن فقہاء نے نصوصِ شرعیہ کی روشنی میں چاندی کے نصاب کو ہمیشہ زکوۃ کے لئے معیار قرار

دیا ہے کیونکہ یہ غریبوں کے فائدے میں زیادہ مناسب ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لأنّ المعتبر في الشرع هو القيمة المثبتة بالنصوص الشرعية، فإن النصّ دلّ على أنّ ما يبلغ مائتي درهم يعتبر نصاباً للزكاة" (فتح القدیر، جلد 2، صفحہ 256، مطبع دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

شیخ ابن نجیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وما هو الأقل من حيث النصاب يعتبر لأنّه أقرب إلى منفعة الفقراء" (البحر الرائق، جلد 2، صفحہ 227، مطبع دارالمعرفۃ، بیروت)

سونے کے نصاب کو اصل قرار دینے کی شرعی بنیاد؟

شریعت نے نصوص میں سونے اور چاندی دونوں کو زکوۃ کے وجوب کے لئے معیار قرار دیا ہے۔ لہٰذا کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا کوئی واضح شرعی اصول نہیں۔ فقہ حنفی میں چاندی کا نصاب ترجیحاً لیا جاتا ہے کیونکہ یہ عام افراد کے لئے قابلِ رسائی اور فقراء کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے۔

علامہ سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"والنصابان جميعاً معتبران على الأصل، ولا يتبع أحدهما الآخر في هذا الحكم" (المبسوط، جلد 2، صفحہ 198، مطبع دارالمعارف، قاہرہ)

نتیجہ:

چاندی کے نصاب کو سونے کے تابع قرار دینا اور سونے کی مالیت کو معیار بنانا فقہ حنفی کے اصولوں کے خلاف ہوگا۔ زکوۃ، قربانی اور صدقہ فطر کے وجوب کے لئے چاندی کا نصاب ہی معتبر رہے گا، کیونکہ اس سے زیادہ افراد مستفید ہوں گے اور فقہاء کا تعامل بھی اسی پر رہا ہے۔

وجوب زکوۃ کے لئے سونے کو معیار بنانے کا حکم

سوال: (2)

نقد رقومات اور اموال تجارت میں سونا یا چاندی کو معیار بنانا نص سے ثابت نہیں ہے، اس لئے اگر غنا کے تحقق اور چاندی کے علاوہ اموال تجارت ونقود میں وجوب زکوۃ کے لئے معیار سونے کو قرار دیا جائے تو شرعا اس کی گنجائش ہے یا نہیں؟

جواب: (2)

اسلامی شریعت میں زکوٰۃ کے مسائل میں نصوصِ شرعیہ اور فقہاء کی تصریحات کے مطابق سونا اور چاندی کو معیار قرار دیا گیا ہے۔ اموالِ تجارت اور نقد رقومات کے نصاب کی تعیین کے لئے چاندی اور سونے کے وزن اور قیمت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ فقہ حنفی میں یہ وضاحت موجود ہے کہ ان دونوں میں سے جسے معیار بنانا

حالات اور ضرورت کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہو، اس کا اعتبار کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ شرعی مقاصد متاثر نہ ہوں۔

دلائل:

ا-قرآن کریم:

اللہ تعالیٰ نے سونے اور چاندی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ" (سورۃ التوبۃ:34)

یہ آیت زکوٰۃ کے وجوب میں سونے اور چاندی کے معیار ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

۲-حدیث شریف:

حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"لَيْسَ فِيمَا دُونَ خَمْسِ أَوَاقٍ صَدَقَةٌ" (صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ الورق، حدیث نمبر:1459)

اس حدیث میں چاندی کے نصاب کا ذکر ہے جو کہ پانچ اوقیہ (تقریباً 612 گرام) ہے۔

۳-فقہ حنفی کی تصریحات:

(ا) ہدایہ:

"وَأَمَّا نِصَابُ الزَّكَاةِ فَتُعْتَبَرُ الْفِضَّةُ وَالذَّهَبُ عَلَى السَّوَاءِ فِي تَقْدِيرِ النِّصَابِ" (ہدایہ، جلد1، صفحہ167، مطبع: دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

ترجمہ: زکوٰۃ کے نصاب کی تعیین میں سونا اور چاندی دونوں کا اعتبار یکساں طور پر کیا جاتا ہے۔

(۲) الدرالمختار:

"يُعْتَبَرُ فِي نِصَابِ التِّجَارَةِ قِيمَتُهُ بِالذَّهَبِ أَوِ الْفِضَّةِ، وَمَا كَانَ أَنْفَعَ لِلْفُقَرَاءِ مِنْهُمَا اعْتُبِرَ" (الدرالمختار مع ردالمحتار، جلد2، صفحہ258، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: اموالِ تجارت کے نصاب میں اس کی قیمت سونے یا چاندی سے لگائی جائے گی، اور ان دونوں میں سے جو فقراء کے حق میں زیادہ نفع بخش ہو، اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔

(۳) فتح القدیر:

"إِذَا كَانَتْ قِيمَةُ أَمْوَالِ التِّجَارَةِ تَبْلُغُ أَحَدَ النِّصَابَيْنِ الذَّهَبَ أَوِ الْفِضَّةَ وُجِبَتْ فِيهَا الزَّكَاةُ، وَالْمُعْتَبَرُ مَا كَانَ أَرْفَقَ بِالْمُسْتَحِقِّينَ"

(فتح القدیر، جلد2، صفحہ107، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: اگر اموالِ تجارت کی قیمت سونے یا چاندی کے کسی ایک نصاب تک پہنچ جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اس نصاب کا اعتبار کیا جائے گا جو مستحقین کے لئے زیادہ موزوں ہو۔

خلاصہ:

نقد رقومات اور اموالِ تجارت کے نصاب میں سونا یا چاندی کو معیار بنانے کی شرعی گنجائش موجود ہے۔ فقہ حنفی کے اصول کے مطابق دونوں میں سے وہ معیار اختیار کیا جا سکتا ہے جو معاشرتی اور اقتصادی حالات کے لحاظ سے مستحقین کے لئے زیادہ مفید ہو۔ لہٰذا اگر غنا کے تحقق اور اموالِ تجارت میں سونے کو معیار بنایا جائے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے، بشرطیکہ مستحقین کے حقوق متاثر نہ ہوں۔

وجوب زکوۃ کے لئے چاندی اور وجوب قربانی کے لئے سونا کو معیار بنانے کا حکم

سوال: (3)

کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ وجوب زکوۃ کے لئے چاندی کے نصاب کو معیار بنایا جائے اور وجوب قربانی کے لئے سونے کے نصاب کا لحاظ کیا جائے، تاکہ کم حیثیت لوگ تنگی میں نہ پڑیں، یہ کہاں تک درست ہے؟

جواب: (3)

وجوبِ زکوٰۃ اور وجوبِ قربانی دونوں اسلامی عبادات ہیں جن کے لئے شریعتِ مطہرہ نے اپنے مستقل اصول وضوابط مقرر فرمائے ہیں۔ فقہ حنفی کے مطابق

زکوٰۃ اور قربانی کے نصاب کا تعین سونے یا چاندی کے نصاب میں سے کسی ایک کو معیار بنا کر کیا جاتا ہے، اور اس میں بدلاؤ یا تخصیص کا اختیار شریعت نے انسانوں کو نہیں دیا۔

فقہی اصول اور دلائل:

فقہ حنفی کی کتابوں میں یہ وضاحت موجود ہے کہ زکوٰۃ اور قربانی دونوں کے لئے نصاب ایک ہی ہوتا ہے، یعنی اگر کسی کے پاس ساڑھے سات تولہ 87.48 (گرام) سونا یا ساڑھے باون تولہ 612.36 (گرام) چاندی یا ان کی مالیت کے برابر مال موجود ہو، تو زکوٰۃ اور قربانی واجب ہوگی۔

فقہ حنفی کے مستند حوالہ جات:

۱-الدر المختار مع رد المحتار

امام ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

"ونصاب الزكاة أحد النقدين، الذهب والفضة، وكذا نصاب الأضحية" (رد المحتار علی الدر المختار، دار الفکر، جلد 2، صفحہ 298، کتاب الزکاۃ، باب النصاب)

ترجمہ: زکوٰۃ کا نصاب دو نقدوں میں سے کسی ایک پر ہوگا، یعنی سونا یا چاندی، اور قربانی کا نصاب بھی یہی ہے۔

۲-الفتاویٰ الہندیہ

"وأما نصاب الأضحية فهو نصاب الزكاة" (الفتاویٰ الہندیہ، دار الفکر، جلد 5، صفحہ 292، کتاب الأضحیۃ)

ترجمہ: قربانی کا نصاب وہی ہے جو زکوٰۃ کا نصاب ہے۔

۳-بدائع الصنائع

علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

"والمعتبر فی الأضحية نصاب الزكاة، لأنهما يشتركان فی كون كل واحد منهما واجباً فی المال" (بدائع الصنائع، دارالکتب العلمیہ، جلد 4، صفحہ 198، کتاب الأضحیۃ)

ترجمہ: قربانی میں زکوٰۃ کا نصاب معتبر ہوگا، کیونکہ دونوں (زکوٰۃ اور قربانی) مال کے واجبات میں سے ہیں۔

فقہ حنفی کی روشنی میں جواب:

فقہ حنفی کے نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ اور قربانی کے نصاب میں تبدیلی یا تخصیص کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو شخص سونے کے نصاب کے مطابق صاحبِ نصاب بن رہا ہو، وہ چاندی کے نصاب کی بنا پر بھی صاحبِ نصاب ہوگا، اور جو چاندی کے نصاب کے مطابق صاحبِ نصاب نہیں ہے، وہ سونے کے نصاب کے مطابق بھی نہیں ہوگا۔

تنگی کے مسئلے کا حل:

شریعت نے ہر عبادت میں استطاعت کا لحاظ رکھا ہے۔ اگر کوئی شخص قربانی کی استطاعت نہیں رکھتا تو اس پر قربانی واجب نہیں۔ زکوٰۃ میں بھی نصاب کے کم یا

زیادہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ زکوٰۃ صرف صاحبِ نصاب افراد پر فرض ہوتی ہے۔

لہٰذا یہ تجویز کہ زکوٰۃ کے لئے چاندی اور قربانی کے لئے سونے کا نصاب اختیار کیا جائے، فقہ حنفی کے اصولوں اور نصوص کے خلاف ہے۔

سونا چاندی دونوں نصاب سے کم ہونے کی صورت میں زکوۃ کا وجوب کس کی مالیت سے ہوگا؟

سوال:(4)

سونا چاندی دونوں نصاب نامکمل رہنے کی صورت میں دونوں کی مجموعی مالیت پر چاندی کے نصاب سے زکوۃ وغیرہ کا حکم لگے گا یا سونے کے نصاب سے؟

جواب:(4)

اگر کسی کے پاس سونا اور چاندی دونوں موجود ہوں لیکن ان میں سے کوئی بھی الگ الگ نصاب کو نہ پہنچے، تو دونوں کو ملا کر ان کی مجموعی قیمت کے حساب سے زکوۃ کا حکم لگایا جائے گا۔ اس میں چاندی کے نصاب کو معیار بنایا جائے گا، کیونکہ فقہاء نے مجموعی مالیت کی بنیاد پر زکوۃ کا حکم چاندی کے نصاب کے اعتبار سے کیا ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت فقہ حنفی کی درج ذیل مستند کتب میں کی گئی ہے:

۱-ہدایہ

فقہ حنفی کی معتبر کتاب الہدایہ میں یہ مسئلہ یوں بیان کیا گیا ہے:

"وإن كان له أموال من الأثمان والعروض تبلغ قيمتها نصابًا وجبت فيها الزكاة؛ لأنها تتعلق بالقيمة، فتعتبر قيمتها، وهو نصاب الفضة" (ہدایہ، کتاب الزکوۃ، باب زکوۃ المال، ج1،ص111، مطبع مکتبہ رحمانیہ، لاہور)

ترجمہ: اگر کسی کے پاس مختلف قسم کے اموال ہوں، جیسے سونا، چاندی، یا تجارتی سامان، اوران کی مجموعی قیمت نصاب کو پہنچ جائے تو زکوۃ واجب ہوگی، کیونکہ زکوۃ قیمت پرواجب ہوتی ہے،اوراس کے نصاب کا معیار چاندی ہوگا۔

۲-ردالمحتار

علامہ شامی فرماتے ہیں:

"ويضم الذهب إلى الفضة لتكميل النصاب عند أبي حنيفة رحمه الله، وعليه الفتوىٰ" (ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الزکوۃ، ج2،ص258، مطبع دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سونے کو چاندی کے ساتھ ملا کر نصاب مکمل کیا جائے گا، اورفتویٰ اسی پر ہے۔

۳-فتاویٰ عالمگیری

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"وإن كان له ذهب وفضة أو عروض فبلغ المجموع نصابًا يجب عليه الزكاة" (الفتاویٰ الہندیہ، کتاب الزکوۃ، الباب الأول، ج1،ص171، مطبع دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: اگر کسی کے پاس سونا، چاندی یا دیگر اموال ہوں اور ان کی مجموعی قیمت نصاب کو پہنچ جائے تو زکوۃ واجب ہوگی۔

حکم کا خلاصہ:

اگر سونا اور چاندی دونوں کا مجموعہ نصاب تک پہنچ جائے تو زکوۃ واجب ہوگی، اور نصاب کا تعین چاندی کے نصاب کے مطابق کیا جائے گا۔

سونا اور چاندی دونوں نصاب سے کم ہوں تو کیا حکم ہے؟

سوال: (5)

چاندی اور سونا دونوں نصاب سے کم ہوں، ایسی صورت میں کیا ان دونوں پر زکوۃ لازم نہیں ہوگی، یا دونوں کی مجموعی قیمت کا لحاظ کرتے ہوئے زکوۃ کے لازم ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا؟

جواب: (5)

فقہ حنفی کے اصول کے مطابق اگر کسی شخص کے پاس چاندی اور سونا دونوں موجود ہوں، لیکن دونوں علیحدہ علیحدہ نصاب کو نہیں پہنچتے، تو ان دونوں کی مجموعی قیمت کو شمار کیا جائے گا۔ اگر مجموعی قیمت چاندی کے نصاب 200 (درہم) یا سونے کے نصاب 20 (مثقال) کی مالیت تک پہنچ جائے، تو زکوۃ واجب ہوگی۔

مستند حوالہ جات:

۱-الدر المختار مع رد المحتار:

فقیہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

”وإن كان عنده من الذهب ما لا يبلغ نصاباً ومن الفضة كذلك ضم أحدهما إلى الآخر في الأصح“ (رد المحتار، جلد 2، صفحہ 295، مطبع دار الفکر، باب زکاۃ المال)

ترجمہ: اگر کسی کے پاس اتنا سونا اور چاندی ہو جو الگ الگ نصاب کو نہ پہنچے، تو صحیح قول کے مطابق ان دونوں کو باہم جمع کیا جائے گا۔

۲-الفتاویٰ الہندیہ:

”وإذا كان عنده ذهب وفضة لا يبلغ كل واحد منهما نصاباً، فإن ضم أحدهما إلى الآخر وبلغ النصاب وجبت الزكاة، وهذا هو الأصح“ (الفتاویٰ الہندیہ، جلد 1، صفحہ 172، مطبع دار الکتب العلمیہ، کتاب الزکاۃ)

ترجمہ: جب کسی کے پاس سونا اور چاندی ہو، جو انفرادی طور پر نصاب تک نہ پہنچے، تو دونوں کو جمع کیا جائے گا، اور اگر مجموعہ نصاب کو پہنچ جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، یہی قول اصح ہے۔

۳-بدائع الصنائع:

امام کاسانیؒ فرماتے ہیں:

”وإن كان عنده ذهب دون النصاب وفضة دون النصاب يضم

أحدهما إلى الآخر ...إذا بلغت قيمتهما نصاباً من الفضة تجب الزكاة" (بدائع الصنائع،جلد2،صفحہ 118، مطبع دار الکتب العلمیۃ، کتاب الزکاۃ)

ترجمہ: اگرکسی کے پاس نصاب سے کم سونا اور نصاب سے کم چاندی ہو،تو دونوں کو باہم جمع کیا جائے گا، اور جب ان کی مجموعی قیمت چاندی کے نصاب تک پہنچ جائے،توزکوۃ واجب ہوگی۔

خلاصہ:

اگر چاندی اور سونا دونوں انفرادی طور پر نصاب کو نہ پہنچیں،لیکن مجموعی طور پر ان کی مالیت نصاب (چاندی کے نصاب) کے برابر یا زیادہ ہوجائے،توزکوۃ واجب ہوگی۔

ضم نصاب میں اجزاء کا اعتبار ہوگا یا قیمت کا؟

سوال:(6)

سونا اور چاندی دونوں میں سے ہر ایک کا نصاب ناقص ہے اور دونوں کو ضم کر کے زکوۃ کے لازم ہونے یا لازم نہ ہونے کا فیصلہ کرنا ہے تو ان دونوں میں ضم اجزاء کے اعتبار سے ہوگا مثلا ایک کا نصف نصاب ہے اور دوسرے کا بھی نصف نصاب ہے ،تو کامل نصاب مان کر زکوۃ لازم ہوگی یا قیمت کے لحاظ سے ضم ہوگا؟

یعنی جب دونوں کی مجموعی قیمت چاندی کے کم سے کم نصاب کو پہنچ جائے تو زکو لازم ہوگی؟ اس مسئلہ میں راجح قول کیا ہے؟ اور موجودہ حالات میں کس قول کو

اختیار کیا جائے؟

جواب:(6)

فقہ حنفی میں اس مسئلے کا تعلق ''ضم'' (سونا اور چاندی کو ایک دوسرے سے ملانے) کے اصول سے ہے۔ اگر کسی کے پاس سونا اور چاندی دونوں میں سے کوئی بھی نصابِ زکوٰۃ کو مکمل نہیں کرتا، تو کیا ان دونوں کو ملایا جائے گا اور زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس بارے میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے۔

۱۔ضم کا اصول فقہ حنفی میں:

فقہ حنفی کے راجح قول کے مطابق سونا اور چاندی کو وزن (یعنی نصاب) کے اعتبار سے نہیں بلکہ قیمت کے اعتبار سے ملایا جائے گا۔ یعنی اگر دونوں کی مجموعی قیمت چاندی کے نصاب 200 (درہم) تک پہنچ جائے، تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۲-دلائل و کتب فقہ کی عبارات:

(أ) الدر المختار مع رد المحتار

علامہ شامی لکھتے ہیں:

''وَإِذَا كَانَ عِنْدَهُ نِصَابٌ غَيْرُ كَامِلٍ مِنَ الذَّهَبِ وَغَيْرُ كَامِلٍ مِنَ الْفِضَّةِ ضَمَّهُمَا بِقِيمَتِهِمَا إِلَى نِصَابِ الْفِضَّةِ'' (رد المحتار علی الدر المختار، جلد 2، صفحہ 283، مطبع دار الفکر، باب الزکاۃ)

ترجمہ: ”جب کسی کے پاس ناقص نصاب ہو سونے کا اور ناقص نصاب ہو چاندی کا، تو ان دونوں کو چاندی کے نصاب کے ساتھ ان کی قیمت کے اعتبار سے ملایا جائے گا“۔

(ب) الفتاویٰ الہندیہ

”فَإِنْ كَانَ عِنْدَهُ ذَهَبٌ لَا يَبْلُغُ نِصَابًا، وَفِضَّةٌ لَا تَبْلُغُ نِصَابًا، فَإِنْ كَانَتْ قِيمَتُهُمَا تَبْلُغُ مِائَتَيْ دِرْهَمٍ وَجَبَتْ الزَّكَاةُ“ (الفتاویٰ الہندیہ، جلد 1، صفحہ 172، مطبع دار الفکر، باب الزکاۃ)

ترجمہ: ”اگر کسی کے پاس سونا ہو جو نصاب کو نہ پہنچے اور چاندی ہو جو نصاب کو نہ پہنچے، لیکن دونوں کی قیمت دوسو درہم تک پہنچ جائے، تو زکوٰۃ واجب ہوگی“۔

(ج) البحر الرائق

”فِي مَسْأَلَةِ ضَمِّ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ إِذَا كَانَ كُلٌّ مِنْهُمَا لَا يَبْلُغُ النِّصَابَ فَإِنَّهُ يُعْتَبَرُ بِالْقِيمَةِ وَلَا يُعْتَبَرُ بِالْوَزْنِ“ (البحر الرائق، جلد 2، صفحہ 214، مطبع دار الکتب العلمیۃ، باب الزکاۃ)

ترجمہ: ”سونے اور چاندی کو ایک دوسرے کے ساتھ ضم کرنے کے مسئلے میں جب ہر ایک نصاب کو نہ پہنچے، تو اس کا اعتبار قیمت کے ساتھ کیا جائے گا، وزن کے ساتھ نہیں“۔

۳- راجح قول اور موجودہ حالات:

فقہ حنفی میں راجح قول یہی ہے کہ قیمت کے اعتبار سے ضم کیا جائے گا۔ موجودہ حالات میں بھی یہی قول اختیار کیا جانا چاہیئے، کیونکہ قیمت کے اعتبار سے ہی

لوگوں کے اموال کا حقیقی اندازہ لگایا جاتا ہے، اور یہ زیادہ آسان اور معقول ہے۔

۴-خلاصہ:

اگر کسی کے پاس سونا اور چاندی دونوں موجود ہوں، لیکن ہر ایک نصاب کو نہ پہنچے، تو ان کی قیمت کو ملا کر فیصلہ کیا جائے گا۔

اگر دونوں کی مجموعی قیمت چاندی کے نصاب 200 (درہم) کے برابر ہو یا اس سے زائد ہو، تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں کی عبارات بھی یہی قول ظاہر کرتی ہیں۔

سامان تجارت اور نقد روپئے کو سونا چاندی کے ساتھ ضم کرنے کا حکم

سوال: (7)

کسی کے پاس سونا یا چاندی کا نصاب ہو یا ان میں سے کسی ایک کا نصاب ہو یا نصاب سے کم سونا اور چاندی ہو لیکن اس کے پاس سامان تجارت اور نقد روپئے بھی ہوں تو کیا سامان تجارت اور نقد روپئے کو سونا یا چاندی کے ساتھ ضم کر کے اس پر بھی زکوۃ لازم ہوگی یا ان چیزوں کو ضم نہیں کیا جائے گا؟

جواب: (7)

شریعتِ مطہرہ کے مطابق اگر کسی شخص کے پاس سونا یا چاندی کا نصاب مکمل

ہو یا نصاب سے کم مقدار ہو لیکن اس کے ساتھ سامانِ تجارت اور نقد رقم بھی ہو تو ان تمام اموال کو جمع کر کے دیکھا جائے گا۔ اگر مجموعہ نصاب کے برابر یا اس سے زائد ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ فقہِ حنفی کے اصول کے مطابق مختلف قسم کے مال (جن پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے) کو جمع کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ سب مال زکوٰۃ کی جنس میں شمار ہوتے ہوں۔

فقہی دلائل:

فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں اس مسئلے کی صراحت موجود ہے:

1- کتاب: فتاویٰ عالمگیری

عبارت: **"ویضم الذهب إلى الفضة، والفضة إلى الذهب في تكميل النصاب عند أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله، وكذا الدراهم والدنانير إلى عروض التجارة"** (فتاویٰ عالمگیری، جلد 1، صفحہ 174، مطبع دار الفکر بیروت)

ترجمہ: امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک سونے کو چاندی کے ساتھ اور چاندی کو سونے کے ساتھ نصاب مکمل کرنے کے لیے جمع کیا جائے گا، اور اسی طرح نقدی کو سامان تجارت کے ساتھ بھی شمار کیا جائے گا۔

۲- کتاب: الهدایہ

عبارت: **"ولا تعتبر المساواة في الجنس؛ لأن النوع الواحد يجمعه الوصف، فيضم الذهب إلى الفضة، وعروض التجارة إليهما"**

(الہدایہ، جلد 1، صفحہ 111، مطبع دار الباز مکہ مکرمہ)

ترجمہ: نصاب کے لیے جنس میں مساوات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا؛ کیونکہ ایک ہی نوع میں وصفِ مالیت مشترک ہوتا ہے، اس لیے سونے کو چاندی کے ساتھ اور سامان تجارت کو ان دونوں کے ساتھ جمع کیا جائے گا۔

۳- کتاب: بدائع الصنائع

عبارت: "**لأن الزكاة تتعلق بالقيمة، والنصاب إنما يكمل بها، لا بالعين**" (بدائع الصنائع، جلد 2، صفحہ 12، مطبع دار الکتب العلمیہ بیروت)

ترجمہ: کیونکہ زکوٰۃ کا تعلق مال کی قیمت کے ساتھ ہے اور نصاب قیمت کے ذریعے مکمل ہوتا ہے، نہ کہ مخصوص مال کے ذریعے۔

وضاحت:

یہ فقہی عبارات واضح کرتی ہیں کہ زکوٰۃ کے حساب میں مختلف اموال، جیسے سونا، چاندی، نقدی اور سامانِ تجارت، کو ایک دوسرے کے ساتھ شامل کیا جا سکتا ہے تاکہ نصاب مکمل ہو۔ نصاب کا معیار سونے یا چاندی کی قیمت ہوگی، اور زکوٰۃ کی ادائیگی اسی کے مطابق ہوگی۔

نتیجہ:

لہٰذا، کسی شخص کے پاس سونا، چاندی، نقدی یا سامانِ تجارت میں سے کوئی ایک نصاب کے برابر نہ ہو لیکن مجموعہ نصاب کو پہنچ جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

چاندی کے نصاب کا مالک زکوۃ لے سکتا ہے؟

سوال:(8)

کسی کے پاس سونا کا نصاب نہیں ہے لیکن چاندی کا نصاب موجود ہے، اور وہ شخص غریب اور تنگ دست ہے، اپنی ضروریات بمشکل پوری کر پاتا ہے، کیا اس شخص کو زکوۃ دی جا سکتی ہے؟ اور کیا وہ شخص زکوۃ لے سکتا ہے؟

جواب:(8)

اسلامی شریعت کے مطابق زکوٰۃ ان لوگوں کو دی جا سکتی ہے جو شرعی فقیر کے حکم میں آتے ہوں۔ شرعی فقیر وہ شخص ہے جس کے پاس ضرورت سے زائد اتنا مال یا وسائل نہ ہوں جو نصاب کے برابر پہنچتے ہوں یا اس سے زائد ہوں۔ اگر کسی شخص کے پاس چاندی کا نصاب موجود ہے لیکن وہ اپنی بنیادی ضروریات زندگی پوری کرنے سے قاصر ہو اور اس کا مال صرف نصاب کی مقدار میں ہو، تو وہ شرعی فقیر شمار ہوگا اور زکوٰۃ لینے کا مستحق ہوگا۔

فقہی دلائل:

فقہِ حنفی کی معتبر کتب میں اس مسئلے کی وضاحت موجود ہے:

ا- کتاب: فتاویٰ عالمگیری

عبارت: ”من ملک نصاباً فاضلاً عن حاجته الأصلية فلا تحل له الصدقة، ومن لا يملک إلا نصاباً يحتاج إليه لحاجته الأصلية، تحل له الصدقة“ (فتاویٰ عالمگیری،جلد 1،صفحہ 170،مطبع دارالفکر بیروت)

ترجمہ: جس شخص کے پاس بنیادی ضروریات سے زائد نصاب موجود ہو، اسے زکوٰۃ لینا جائز نہیں، لیکن اگر کسی کے پاس نصاب موجود ہو اور وہ اس کی بنیادی ضروریات میں صرف ہو رہا ہو، تو اسے زکوٰۃ لینا جائز ہے۔

۲- کتاب: البحر الرائق

عبارت:”ولا يعتبر فی المنع ملک النصاب، بل الغنی المانع للزكاة هو ملک نصاب فارغ عن الحاجة الأصلية“ (البحر الرائق،جلد 2،صفحہ 283،مطبع دارالکتب العلمیہ بیروت)

ترجمہ: زکوٰۃ لینے سے روکنے کے لیے صرف نصاب کا مالک ہونا کافی نہیں، بلکہ ایسا نصاب جو ضروریات سے فارغ ہو، شرط ہے۔

۳- کتاب: بدائع الصنائع

عبارت:”إن كان محتاجاً إلى ما يملكه بحيث لو صرفه إلى حاجته وقع فی الحرج، فإنه يجوز أن يأخذ الزكاة“ (بدائع الصنائع،جلد 2،صفحہ 118،مطبع دارالکتب العلمیہ بیروت)

ترجمہ: اگر کسی کے پاس موجود مال اس کی بنیادی ضروریات میں صرف ہو جائے اور وہ سختی میں مبتلا ہو جائے، تو ایسے شخص کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے۔

وضاحت:

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس چاندی کا نصاب تو موجود ہے، لیکن وہ اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے میں ناکام ہے، اور اس نصاب کو خرچ کیے بغیر وہ اپنا گزر بسر نہیں کر سکتا، تو وہ شرعی فقیر شمار ہوگا۔ ایسے شخص کو زکوٰۃ لینا جائز ہے، اور دوسروں کے لیے جائز ہے کہ اسے زکوٰۃ دی جائے۔

نتیجہ:

مذکورہ شخص کے پاس چاندی کا نصاب ہونے کے باوجود، اگر وہ اپنی ضروریات بمشکل پوری کر پاتا ہے اور اس کا نصاب ضروریات زندگی میں صرف ہو رہا ہو، تو وہ شرعی فقیر کے زمرے میں آتا ہے اور زکوٰۃ لینا اس کے لیے جائز ہے۔

گھریلو سامان حوائج اصلیہ سے زائد ہو تو وہ زکوۃ لے سکتا ہے؟

سوال: (9)

کسی کے پاس سونا یا چاندی نصاب کے بقدر نہیں ہے لیکن اس کے پاس حوائج اصلیہ سے زائد گھریلو سامان اس قدر ہے کہ اس کی مالیت چاندی کے نصاب کو پہنچ جاتی ہے، تو کیا ایسے شخص کے لئے زکوۃ لینا درست ہوگا؟

جواب:(9)

اسلامی شریعت کے مطابق، جس شخص کے پاس حوائجِ اصلیہ (بنیادی ضروریات جیسے رہائش، لباس، کھانے پینے کا سامان، سواری وغیرہ) سے زائد مال یا اشیاء موجود ہوں اور ان کی مجموعی مالیت چاندی کے نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ ہو، تو وہ شرعی فقیر نہیں کہلائے گا۔ ایسے شخص کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ زکوٰۃ لینے کا استحقاق اسی کو ہوتا ہے جو شرعی فقیر ہو، یعنی جس کے پاس نصابِ زکوٰۃ کی مقدار موجود نہ ہو اور وہ اپنی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہو۔

فقہی دلائل:

۱-الفتاویٰ الہندیۃ

عبارت:"وَإِنْ كَانَتْ لَهُ دَارٌ يَسْكُنُهَا وَعَبِيدٌ يَخْدِمُونَهُ، وَثِيَابُ بُذْلَتِهِ وَفَضْلَةُ أَمْوَالٍ تَبْلُغُ نِصَابًا، لَا تَحِلُّ لَهُ الصَّدَقَةُ" (الفتاویٰ الہندیۃ، جلد 1، صفحہ 170، کتاب الزکاۃ، الباب الأول فی المصارف، مطبع: دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: اگر کسی کے پاس ایک گھر ہو جس میں وہ رہتا ہو، خادم ہوں جو اس کی خدمت کرتے ہوں، پہننے کے لیے کپڑے ہوں اور اضافی مال اتنا ہو کہ نصاب کو پہنچ جائے، تو اس کے لیے صدقہ (زکوٰۃ) لینا جائز نہیں۔

۲-البحر الرائق

عبارت:"فَإِنْ كَانَ يَمْلِكُ مَا يَفْضُلُ عَنْ حَاجَتِهِ الْأَصْلِيَّةِ وَيَبْلُغُ

نِصَابًا، فَهُوَ غَنِیٌّ وَيَحْرُمُ عَلَيْهِ أَخْذُ الزَّكَاةِ" (البحرالرائق، جلد2، صفحہ 285، کتاب الزکاۃ، باب المصرف، مطبع: دارالکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: اگر کسی شخص کے پاس اپنی بنیادی ضروریات سے زائد ایسا مال ہو جو نصاب کو پہنچ جائے، تو وہ غنی شمار ہوگا اور اس کے لیے زکوٰۃ لینا حرام ہوگا۔

۳-بدائع الصنائع

عبارت: "وَأَمَّا الْغِنَى الْمَانِعُ لِأَخْذِ الزَّكَاةِ فَهُوَ أَنْ يَمْلِكَ نِصَابًا فَاضِلًا عَنْ حَاجَتِهِ الْأَصْلِيَّةِ" (بدائع الصنائع، جلد2، صفحہ 119، کتاب الزکاۃ، فصل فی المصارف، مطبع: دارالکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: زکوٰۃ لینے سے منع کرنے والی غناء (مالداری) یہ ہے کہ کسی کے پاس ایسا نصاب موجود ہو جو اس کی بنیادی ضروریات سے زائد ہو۔

وضاحت:

ان عبارات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس حوائجِ اصلیہ سے زائد گھریلو سامان، زیورات یا کوئی اور مال موجود ہو اور اس کی مالیت چاندی کے نصاب کو پہنچ جائے (اس وقت تقریباً 612.36 گرام چاندی یا اس کی مالیت)، تو وہ شرعی غنی شمار ہوگا اور زکوٰۃ کا مستحق نہیں رہے گا۔

نتیجہ:

لہٰذا، ایسے شخص کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ شرعی فقیر کے زمرے میں نہیں آتا ہے۔

مساجد میں خواتین کی آمد کا شرعی حکم

محور اول: تمہیدی سوالات

اسلام میں مساجد کا کردار و مقاصد

سوال:(1)

اسلامی نظام حیات میں مساجد کا کیا مقام اور کردار ہے؟ اور مسجدوں کی تعمیر کے کیا کیا مقاصد ہیں؟

جواب:(1)

اسلامی نظامِ حیات میں مساجد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مسجد نہ صرف عبادات کا مقام ہے بلکہ مسلمانوں کی تعلیمی، تربیتی، سماجی، اور سیاسی زندگی کا مرکز بھی رہی ہے۔ اس کا مقصد صرف نماز کی ادائیگی تک محدود نہیں بلکہ یہ ایمان کی تجدید، اخلاقی تعمیر، دینی شعور کی بیداری، اور معاشرتی اتحاد کے لیے بنیادی ادارہ ہے۔

قرآن کریم میں مساجد کا مقام:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مساجد کی اہمیت کو واضح طور پر بیان فرمایا:

"أَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ للَّهِ أَحَدًا" (سورۃ الجن:18)

ترجمہ: "اور مساجد اللہ کے لیے ہیں، تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ"۔

یہ آیت مساجد کی تقدیس اور ان کے صرف اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"فِي بُيُوتٍ أَذِنَ لِلَّهُ أَن تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا سْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِلْغُدُوِّ وَلْآصَالِ" (سورۃ النور:36)

ترجمہ: "یہ وہ گھر ہیں جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ انہیں بلند کیا جائے اور ان میں اس کا نام لیا جائے، ان میں صبح وشام اس کی تسبیح کرنے والے ہیں"۔

احادیث مبارکہ میں مساجد کا مقام:

رسول اللہ ﷺ نے مساجد کو دین کا قلب قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"مَنْ بَنَى مَسْجِدًا لِلَّهِ بَنَى اللَّهُ لَهُ مِثْلَهُ فِي الْجَنَّةِ" (صحیح بخاری:450، صحیح مسلم:533)

ترجمہ: "جو شخص اللہ کے لیے مسجد بنائے، اللہ اس کے لیے جنت میں ویسا ہی گھر بنائے گا"۔

مسجدوں کے مقاصد:

۱–عبادت کا مقام: نماز، تلاوتِ قرآن، اور ذکر واذکار کے لیے مساجد بنائی

جاتی ہیں۔

۲-تعلیم وتربیت: مساجد اسلامی تعلیمات سکھانے اور روحانی تربیت کے مراکز ہیں۔

۳- اجتماعی امور: مسلمانوں کے باہمی معاملات طے کرنے اور اتحاد کا مظاہرہ کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

۴-اصلاحِ معاشرہ: مساجد کے ذریعے اسلامی احکامات کی تبلیغ اور سماجی برائیوں کی اصلاح کی جاتی ہے۔

فقہِ حنفی کے مستند اقوال:

فقہِ حنفی میں مساجد کی اہمیت کے متعلق واضح احکام موجود ہیں:

"إِنَّ الْمَسَاجِدَ مَوَاضِعُ الصَّلَوَاتِ وَالذِّكْرِ وَالتَّعَلُّمِ وَتَعْلِيمِ الْعِلْمِ، وَلِذٰلِكَ صَارَتْ مَحَالَّ الْبَرَكَةِ وَالرَّحْمَةِ" (ردالمحتار علی الدر المختار، جلد 1، صفحہ 659، مطبع دار الفکر، باب المساجد)

ترجمہ: "یقیناً مساجد نماز، ذکر، اور علم کی تعلیم وتعلم کے مقامات ہیں، اسی وجہ سے یہ برکت اور رحمت کے مراکز بن گئے ہیں"۔

"قَالَ أَبُو حَنِيفَةَ: إِنَّ إِقَامَةَ الْجَمَاعَةِ فِي الْمَسَاجِدِ شِعَارُ الدِّينِ، وَلَايَحِلُّ تَرْكُهَا إِلَّا لِعُذْرٍ" (فتاویٰ قاضی خان، جلد 1، صفحہ 120، مطبع دار العلوم، باب صلوٰۃ الجماعۃ)

ترجمہ: "امام ابو حنیفہ نے فرمایا: جماعت کے ساتھ نماز قائم کرنا دین کی

علامت ہے، اور بغیر عذر کے اسے ترک کرنا جائز نہیں''۔

خلاصہ:

مساجد اسلامی معاشرت کا مرکز اور مسلمانوں کی روحانی، تعلیمی، اور سماجی ترقی کا اہم ذریعہ ہیں۔قرآن وحدیث اور فقہ حنفی کی روشنی میں مساجد کی اہمیت واضح ہے اور ان کا کردار امت کی اصلاح وتربیت کے لیے ناگزیر ہے۔

عورتوں کا نماز کے لئے مسجد جانا احادیث کی روشنی میں

سوال:(2)

احادیث سے نماز کی خاطر خواتین کے مسجد میں آنے کے سلسلہ میں کیا ثابت ہوتا ہے؟

جواب:(2)

خواتین کے مسجد میں نماز کے لیے آنے کے سلسلے میں احادیث اور فقہ حنفی کی مستند کتب میں تفصیلی بحث موجود ہے۔احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابتدائے اسلام میں عورتوں کو مسجد میں آنے کی اجازت دی گئی تھی، لیکن بعد کے زمانوں میں فتنہ کے اندیشے کے پیش نظر اس کی ممانعت کی گئی۔ ذیل میں مسئلہ کی وضاحت احادیث اور فقہ حنفی کی مستند کتب سے کی جاتی ہے:

احادیث کی روشنی میں:

۱-حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لَا تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللَّهِ مَسَاجِدَ اللَّهِ" (صحیح البخاری، حدیث:900، صحیح مسلم، حدیث:442)

ترجمہ: "اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد میں آنے سے نہ روکو"۔

یہ حدیث اس وقت کی ہے جب عورتوں کا مسجد میں آنا فتنے سے پاک تھا۔

۲-حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"لَوْ أَدْرَكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا أَحْدَثَ النِّسَاءُ لَمَنَعَهُنَّ كَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ" (صحیح البخاری، حدیث:869، صحیح مسلم، حدیث:445)

ترجمہ: "اگر رسول اللہ ﷺ ان تبدیلیوں کو دیکھتے جو عورتوں نے پیدا کیں، تو انہیں (مسجد آنے سے) روک دیا جاتا، جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روکا گیا تھا"۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانے کے حالات کے پیش نظر حکم میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہ حنفی میں عورتوں کے مسجد میں آنے کے متعلق واضح موقف یہ ہے کہ اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو اجازت دی جا سکتی ہے، لیکن فتنہ کے دور میں عورتوں کا مسجد میں آنا مناسب نہیں۔

۱-علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یُکْرَہُ لِلنِّسَاءِ الشَّوَابِّ حُضُورُ الْجَمَاعَةِ فِی الْمَسَاجِدِ، لِمَا فِیهِ مِنَ الْفِتْنَةِ، وَأَمَّا الْعَجَائِزُ لَا یُکْرَہُ لَهُنَّ الْخُرُوجُ إِذَا کَانَ بِاللَّیْلِ، وَعَلَی ذٰلِکَ یُحْمَلُ حَدِیثُ: (لَا تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ)"

(ردالمحتار، ج2، ص365، مطبع دارالفکر بیروت)

ترجمہ: "جوان عورتوں کے لیے مسجد میں جماعت کے لیے آنا مکروہ ہے، کیونکہ اس میں فتنے کا اندیشہ ہے، البتہ بوڑھی عورتوں کے لیے اگر رات کے وقت نکلیں تو اس میں کوئی کراہت نہیں۔ اور اسی پر 'اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد سے نہ روکو' والی حدیث کو محمول کیا جائے گا"۔

۲-علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں:

"وَکَانَ النِّسَاءُ فِی زَمَنِهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلَی حَالٍ لَا یُوجَدُ مِثْلُهَا الْآنَ فِی التَّسَتُّرِ وَالتَّوَقِّی عَنِ الْفِتَنِ" (ردالمحتار، ج2، ص366)

ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں ایسی حالت میں تھیں کہ آج کل جیسی بے پردگی اور فتنے کا اندیشہ نہیں تھا"۔

۳-فتاویٰ عالمگیری:

"یُکْرَہُ خُرُوجُهُنَّ إِلَی الْمَسَاجِدِ لِصَلَاةِ الْجَمَاعَةِ" (الفتاویٰ الہندیۃ، ج1، ص56، مطبع رشیدیہ)

ترجمہ: "عورتوں کا جماعت کے لیے مسجد جانا مکروہ ہے"۔

نتیجہ:

احادیث و فقہ حنفی کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو عورتوں کے لیے مسجد میں آنے کی مشروط اجازت دی جا سکتی ہے۔ تاہم، موجودہ دور میں بے پردگی اور فتنوں کے عام ہونے کی وجہ سے فقہاء نے عورتوں کو گھروں میں نماز پڑھنے کو افضل قرار دیا ہے۔

محور دوم:

عورتوں کا عہد نبوی میں مسجد میں آنے کے بارے میں صحابہ کا موقف

سوال: (1)

عہد نبوی میں خواتین کی مسجد میں آمد کے بارے میں اقوال صحابہ کیا ہیں اور اس سلسلہ میں ان کا موقف کیا رہا ہے؟

جواب: (1)

عہد نبوی میں خواتین کی مساجد میں آمد کی اجازت دی گئی تھی، لیکن یہ اجازت کچھ شرائط اور آداب کے ساتھ مشروط تھی۔ قرآن و حدیث اور صحابہ کرام کے

اقوال میں اس سلسلے میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ درج ذیل میں اس موضوع پر ایک مکمل مدلل جواب پیش کیا جا رہا ہے:

1-قرآن کریم کی رہنمائی:

قرآن کریم نے عمومی طور پر عبادت کے مقامات میں مرد و عورت دونوں کی شمولیت کا ذکر کیا ہے:

"وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ" (سورۃ البقرہ:43)

اس آیت میں مرد و عورت دونوں کو نماز کے قیام کی دعوت دی گئی ہے۔

۲-حدیث نبوی کی روشنی میں:

رسول اللہ ﷺ نے خواتین کو مسجد میں آنے کی اجازت دی لیکن ان کے لیے بعض حدود و آداب متعین فرمائے:

ا-حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے:

"قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: لَا تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللَّهِ مَسَاجِدَ اللَّهِ، وَلْيَخْرُجْنَ وَهُنَّ تَفِلَاتٌ" (صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، حدیث:442)

ترجمہ: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد میں آنے سے مت روکو، لیکن وہ ایسے نکلیں کہ خوشبو نہ لگا رکھی ہو"۔

۲-حضرت عائشہؓ کا بیان:

"لَوْ أَدْرَکَ النَّبِیُّ ﷺ مَا أَحْدَثَ النِّسَاءُ لَمَنَعَهُنَّ الْمَسَاجِدَ"

(صحیح بخاری، کتاب الأذان، حدیث:869)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "اگر نبی کریم ﷺ اس زمانے کی عورتوں کے حالات دیکھ لیتے تو انہیں مسجد جانے سے روک دیتے"۔

۳-اقوال صحابہ کرام:

۱-حضرت عمرؓ کا موقف:

حضرت عمر بن خطابؓ خواتین کے مسجد میں آنے کے بارے میں محتاط تھے، خاص طور پر اس وقت جب معاشرتی حالات میں تبدیلی آ گئی تھی۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ عورتیں گھروں میں نماز ادا کریں تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتر ہے۔

"وَصَلَاةُ الْمَرْأَةِ فِي بَيْتِهَا خَيْرٌ مِنْ صَلَاتِهَا فِي الْمَسْجِدِ" (سنن أبي داود، حدیث:567)

۲-حضرت ابن مسعودؓ:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:

"لِلنِّسَاءِ مَسَاجِدُهُنَّ فِي بُيُوتِهِنَّ" (مسند احمد، حدیث:566)

ترجمہ: "عورتوں کی مساجد ان کے گھروں میں ہیں"۔

۴-شرائط اور آداب:

عہد نبوی میں خواتین کو مساجد میں آنے کی اجازت کے ساتھ درج ذیل شرائط کا لحاظ رکھنے کا حکم دیا گیا:

۱-وہ خوشبو یا زینت کے ساتھ نہ نکلیں۔

۲-مردوں سے الگ صفوں میں نماز ادا کریں۔

۳-نماز کے بعد فوراً واپس چلی جائیں، غیر ضروری اجتماع نہ کریں۔

۵-خلاصہ اور موجودہ دور کے لیے رہنمائی:

اسلام نے خواتین کو عبادت کی اجازت دی لیکن ان کے لیے گھر کو زیادہ بہتر عبادت گاہ قرار دیا ہے تاکہ فتنوں سے بچاؤ ہو۔ موجودہ دور میں بھی عورت اگر مکمل پردے کے ساتھ، فتنہ سے محفوظ ہو کر، اور شرعی آداب کا خیال رکھتے ہوئے مسجد میں جانا چاہے تو منع نہیں، لیکن اس کے لیے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔

دلائل کا خلاصہ:

۱-صحیح بخاری، حدیث: 869

۲-صحیح مسلم، حدیث: 442

۳-سنن أبی داود، حدیث: 567

عورتوں کے لئے گھر میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال:(2)

خواتین کے لئے اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب:(2)

خواتین کے لیے اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی شرعی حیثیت کے متعلق احادیثِ مبارکہ اور فقہ حنفی کی کتب میں واضح طور پر ہدایات موجود ہیں کہ عورتوں کے لیے گھر میں نماز پڑھنا زیادہ فضیلت اور بہتر ہے، خصوصاً اُن کے لیے گھر کے اندرونی حصے (اندرونِ خانہ) کو افضل قرار دیا گیا ہے۔

1-حدیث شریف کا حوالہ:

حضرت ام حمید الساعدیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کا شوق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"قد علمتُ أنک تحبین الصلاۃ معی، وصلاتک فی بیتک خیرٌ لک من صلاتک فی حجرتک، وصلاتک فی حجرتک خیرٌ لک من صلاتک فی دارک، وصلاتک فی دارک خیرٌ لک من صلاتک فی مسجد قومک، وصلاتک فی مسجد قومک خیرٌ

لک من صلاتک فی مسجدی" (سنن ابی داؤد:570)

ترجمہ: "مجھے معلوم ہے کہ تم میرے ساتھ نماز پڑھنے کو پسند کرتی ہو، لیکن تمہاری اپنے گھر میں نماز تمہارے حجرے کی نماز سے بہتر ہے، اور تمہاری اپنے حجرے میں نماز تمہارے صحن کی نماز سے بہتر ہے، اور تمہاری اپنے صحن میں نماز تمہارے قبیلے کی مسجد کی نماز سے بہتر ہے، اور تمہاری قبیلے کی مسجد میں نماز میری مسجد میں نماز سے بہتر ہے"۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کے لیے گھر میں نماز پڑھنا زیادہ فضیلت کا حامل ہے۔

۲- فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے حوالہ:

(الف): امام کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"**والمرأةُ لا يُستحبُّ لها حضورُ الجماعة، بل صلاتها فی بيتها أفضلُ**" (بدائع الصنائع، جلد 1، صفحہ 157، مطبع دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: "عورت کے لیے جماعت میں حاضر ہونا مستحب نہیں ہے، بلکہ اس کی اپنے گھر میں نماز زیادہ افضل ہے"۔

(ب): امام سرخسی رحمہ اللہ اپنی مشہور کتاب "المبسوط" میں لکھتے ہیں:

"**والمرأةُ صلاتُها فی بيتها أفضلُ من صلاتها فی المسجد**"

(المبسوط، جلد 1، صفحہ 139، مطبع دار المعرفۃ)

ترجمہ: ''عورت کی اپنے گھر میں نماز مسجد میں نماز سے افضل ہے''۔

(ج): علامہ مرغینانی رحمہ اللہ ''الہدایہ'' میں فرماتے ہیں:

''ولأنها ليست من أهل الجماعات فكان الأولى لها البيت''

(الہدایہ، جلد 1، صفحہ 84، مطبع داراحیاء التراث العربی)

ترجمہ: ''کیونکہ عورت جماعت کی اہل نہیں ہے، لہٰذا اس کے لیے گھر افضل ہے''۔

خلاصہ:

خواتین کے لیے شریعت میں یہ واضح حکم ہے کہ ان کے لیے گھر میں نماز پڑھنا زیادہ افضل اور باعثِ اجر ہے۔ خاص طور پر گھر کے اندرونی حصے میں نماز ادا کرنا جماعت میں شرکت کرنے سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ احادیث مبارکہ اور فقہ حنفی کی مستند کتب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عورتوں کا گھر میں نماز پڑھنا زیادہ محفوظ اور بہتر عمل ہے۔

خواتین کی مسجد میں نماز کے لئے آنے کے بارے میں ائمہ اربعہ کا موقف

سوال: (3)

خواتین کی مسجدوں میں نماز کے لئے آمد کے بارے میں علماء کی آراء،

ائمۂ اربعہ کا موقف ومسلک کیا ہے؟

جواب:(3)

خواتین کی مسجد میں نماز کے لیے آمد کے مسئلے میں فقہاء کے درمیان مختلف آراء پائی جاتی ہیں، جن کی بنیاد قرآن وسنت، صحابہ کرام کے عمل اور شرعی مصالح پر ہے۔ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کا موقف اس مسئلے میں واضح ہے اور ان کی آراء درج ذیل ہیں:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا موقف:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک خواتین کے لیے مسجد میں نماز ادا کرنا مکروہ تنزیہی ہے، خصوصاً نوجوان خواتین کے لیے، تاکہ فتنے سے بچا جا سکے۔البتہ بڑی عمر کی خواتین کو اجازت دی گئی ہے، بشرطیکہ فتنہ کا خطرہ نہ ہو۔

دلائل:

۱-حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

"صلاتُها فی بیتِها أفضلُ من صلاتِها فی مسجدِها، وصلاتُها فی مسجدِها أفضلُ من صلاتِها فی جماعتِها" (مصنف عبدالرزاق، ج3، ص152، دارالکتب العلمیہ)

۲-علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَكُرِهَ لِلنِّسَاءِ شُهُودُ الْجَمَاعَةِ لِمَا فِيهِ مِنَ الْفِتْنَةِ إلَّا الْعَجَائِزَ"

(ردالمحتار،ج1،ص566،دارالفکر)

امام مالک رحمہ اللہ کا موقف:

امام مالک رحمہ اللہ بھی عمومی طور پر خواتین کو مسجد میں جانے سے منع کرتے ہیں، خاص طور پر نوجوان خواتین کو، لیکن وہ عمر رسیدہ خواتین کے لیے نرمی کا پہلو رکھتے ہیں، بشرطیکہ وہ پردے کا مکمل اہتمام کریں۔

دلائل:

ا-امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول نقل کیا:

"لَوْ أَدْرَكَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَا أَحْدَثَ النِّسَاءُ لَمَنَعَهُنَّ كَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ" (الموطأ،ج1،ص197،داراحیاءالتراث العربی)

امام شافعی رحمہ اللہ کا موقف:

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک خواتین کے لیے مسجد میں جانا جائز ہے، بشرطیکہ فتنے کا اندیشہ نہ ہو اور وہ شرعی آداب کا لحاظ رکھیں۔

دلائل:

ا-امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لَا أَمْنَعُ الْمَرْأَةَ الشَّابَّةَ أَنْ تَخْرُجَ إِلَى الْمَسْجِدِ، بَلْ آمُرُهَا بِالْإِحْتِشَامِ" (الأم،ج1،ص188،دارالمعارف)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا موقف:

امام احمد رحمہ اللہ بھی خواتین کو مسجد میں نماز کے لیے جانے کی اجازت دیتے ہیں، لیکن ان کی رائے یہ ہے کہ گھر کی نماز زیادہ افضل ہے۔

دلائل:

۱- نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"لَا تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللَّهِ مَسَاجِدَ اللَّهِ، وَلَكِنْ بُيُوتُهُنَّ خَيْرٌ لَهُنَّ"

(مسند احمد، ج2، ص76، دارالسلام)

جدید علماء کی آراء:

جدید علماء عرب میں سے بعض، جیسے شیخ ابن باز اور شیخ ابن عثیمین رحمہما اللہ، نے خواتین کے مسجد جانے کو مشروط طور پر جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو اور خواتین شرعی پردہ کریں۔

شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"خُرُوجُ النِّسَاءِ إِلَى الْمَسَاجِدِ مَشْرُوطٌ بِعَدَمِ الْفِتْنَةِ، وَفِي زَمَانِنَا الْأَفْضَلُ لَهُنَّ أَنْ يُصَلِّينَ فِي بُيُوتِهِنَّ" (مجموع فتاوی ابن باز، ج12، ص282)

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"إِذَا أَمِنَتِ الْفِتْنَةُ، فَلاَ حَرَجَ فِي خُرُوجِهِنَّ لِلصَّلاَةِ، وَلَكِنَّ فَضْلَ الصَّلاَةِ فِي بُيُوتِهِنَّ أَعْظَمُ" (مجموع فتاوی ابن عثیمین، ج15، ص422)

خلاصہ:

۱-ائمہ اربعہ کا عمومی موقف یہ ہے کہ خواتین کے لیے مسجد میں نماز پڑھنا جائز ہے، لیکن فتنے سے بچاؤ کے لیے گھر میں نماز زیادہ افضل ہے۔

۲-جدید علماء کی آراء بھی اسی اصول کے گرد گھومتی ہیں کہ فتنہ نہ ہو تو اجازت ہے، لیکن گھر کی نماز افضل ہے۔

۳-خواتین کو شرعی پردے، خوشبو اور زیب و زینت سے اجتناب کے ساتھ مسجد آنے کی اجازت دی جا سکتی ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ وہ گھر میں نماز ادا کریں۔

عصر حاضر میں عورتوں کے مسجد میں آنے کے بارے میں حکم

سوال: (4)

موجودہ دور میں عورتوں کے مسجد میں نماز کے لئے آنے کے سلسلہ میں کون سا موقف بہتر اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے؟ ان کو مسجد میں آنے کی اجازت دی جائے یا نہیں؟

جواب:(4)

عورتوں کے مسجد میں نماز کے لیے آنے کے مسئلے پر اسلامی شریعت میں تفصیلی بحث موجود ہے۔اس سلسلے میں درج ذیل امور کو مدنظر رکھتے ہوئے مسئلے کو سمجھنا ضروری ہے:

ا-قرآن وسنت کی رہنمائی:

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں عورتوں کو مسجد میں آنے سے منع نہیں کیا گیا، بلکہ اجازت دی گئی ہے بشرطیکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو:

قرآن کریم میں فرمایا گیا:

"وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ"(البقرۃ:43)

"نماز قائم کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو"۔

یہ عمومی حکم ہے، جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں۔

احادیث میں بھی عورتوں کے مسجد آنے کے بارے میں واضح احکام ملتے ہیں:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"لَا تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللَّهِ مَسَاجِدَ اللَّهِ" (صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، حدیث:442)

"اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں جانے سے مت روکو"۔

ایک اور روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا:

"إِذَا اسْتَأْذَنَتْ أَحَدَكُمُ امْرَأَتُهُ إِلَى الْمَسْجِدِ، فَلَا يَمْنَعُهَا"

(صحیح البخاری، کتاب الأذان، حدیث:900)

''اگر تمہاری عورتیں مسجد جانے کی اجازت طلب کریں تو انہیں منع نہ کرو''۔

۲-فقہاء کا موقف:

فقہاء کے درمیان عورتوں کے مسجد آنے کے سلسلے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے:

(۱) حنفیہ:

حنفیہ کے نزدیک آج کے دور میں عورتوں کا مسجد میں جانا مکروہ ہے، کیونکہ فتنہ کا اندیشہ زیادہ ہے۔امام طحاویؒ فرماتے ہیں:

''وَكَرِهُوا لِلنِّسَاءِ الْخُرُوجَ إِلَى الْمَسَاجِدِ وَالصَّلَاةَ فِي الْجَمَاعَةِ'' (شرح معانی الآثار، جلد:1، صفحہ:381، دارالکتب العلمیۃ)

''فقہاء نے عورتوں کے مسجد میں جانے اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کو مکروہ قرار دیا ہے''۔

(۲) شافعیہ، مالکیہ، اور حنابلہ:

ان مکاتب فکر کے نزدیک عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت ہے بشرطیکہ وہ شرعی پردے اور دیگر آداب کی پابندی کریں، اور فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔

۳-عصری تقاضوں کے مطابق موقف:

موجودہ دور میں عورتوں کے مسجد میں جانے کا حکم حالات پر مبنی ہے:

۱-اگر فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، عورتیں شرعی لباس میں ہوں، اور ان کے لیے الگ انتظام ہو تو ان کا مسجد میں جانا جائز ہے۔

۲-اگر فتنہ یا اختلاط کا اندیشہ ہو، تو مسجد جانے سے روکنا بہتر ہے، کیونکہ شریعت میں فتنہ سے بچاؤ کو فوقیت دی گئی ہے۔

عصری حالات میں احتیاطی تدابیر:

عورتوں کے لیے علیحدہ داخلے اور نماز کی جگہ کا انتظام ہو۔

شرعی حدود اور پردے کی مکمل رعایت ہو۔

غیر ضروری اختلاط سے گریز کیا جائے۔

۴-خلاصہ وفیصلہ:

اسلامی شریعت کے اصولوں کے مطابق عورتوں کو مسجد میں آنے سے مطلقاً منع نہیں کیا جا سکتا، لیکن حالات اور ماحول کے مطابق اجازت یا ممانعت کا فیصلہ ہوگا۔ آج کے دور میں جہاں کئی مساجد میں عورتوں کے لیے علیحدہ انتظام موجود ہے، وہاں ان کے مسجد آنے کی اجازت دی جا سکتی ہے، بشرطیکہ شرعی حدود کی مکمل پابندی ہو اور فتنے کا خطرہ نہ ہو۔

عورتوں کے مسجد میں آنے کی ممانعت کے اسباب

سوال:(5)

عورتوں کو مسجد میں آنے سے ممانعت کا سبب صرف فتنہ کا اندیشہ ہے یا اس کے دیگر اسباب بھی ہیں؟

جواب:(5)

مسجد میں عورتوں کے آنے کی ممانعت کی اصل بنیاد ''فتنہ'' کا اندیشہ ہے، لیکن فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ دیگر اسباب بھی موجود ہیں، جن کی بنا پر عورتوں کو مسجد میں آنے سے روکا گیا ہے۔ان اسباب کو سمجھنے کے لیے فقہ حنفی کی مستند کتابوں کی عبارات پیش کی جاتی ہیں:

پہلی عبارت:

امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَكَرِهْنَا لِلنِّسَاءِ الشُّبَّانِ أَنْ يَشْهَدْنَ الْجَمَاعَةَ فِي الْمَسَاجِدِ لِأَنَّ فِي ذٰلِكَ فِتْنَةً، وَكَرِهْنَا لِلْعَجَائِزِ ذٰلِكَ أَيْضًا؛ لِأَنَّهُنَّ قَدْ يَكُنَّ أَيْضًا فِتْنَةً'' (کتاب الأصل المعروف بالمبسوط، مصنف امام محمد بن حسن شیبانی، دار الجیل، بیروت، جلد ۱، صفحہ ۱۳۸، باب خروج النساء إلی الصلاۃ)

ترجمہ: ''ہم نے جوان عورتوں کے لیے مساجد میں جماعت میں شریک ہونے کو ناپسند کیا، کیونکہ اس میں فتنہ ہے، اور بوڑھی عورتوں کے لیے بھی اسے ناپسند کیا، کیونکہ وہ بھی فتنہ کا ذریعہ بن سکتی ہیں''۔

دوسری عبارت:

علامہ سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَقَدْ نُهِينَ النِّسَاءُ عَنِ الْخُرُوجِ إِلَى الْمَسَاجِدِ فِي زَمَانِنَا، لِأَنَّهُ ظَهَرَ فِي النَّاسِ الْفَسَادُ، وَالْفِتْنَةُ فِي خُرُوجِهِنَّ أَكْثَرُ'' (المبسوط، علامہ سرخسی، دارالمعرفہ، بیروت، جلد۲، صفحہ۲۸، باب الصلوات)

ترجمہ: ''ہمارے زمانے میں عورتوں کو مساجد میں جانے سے روکا گیا، کیونکہ لوگوں میں فساد پھیل چکا ہے اور ان کے نکلنے سے فتنہ کا زیادہ خطرہ ہے''۔

تیسری عبارت:

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''وَكُرِهَ ذَهَابُهُنَّ إِلَى الْجَمَاعَةِ لِأَنَّهُ مَظِنَّةُ الْفِتْنَةِ وَقَدْ يَكُونُ الْفِتْنَةُ فِي خُرُوجِهِنَّ نَفْسِهَا، فَتَكُونُ مَفْسَدَةً فِي الدِّينِ'' (فتح القدیر، علامہ ابن ہمام، دارالفکر، بیروت، جلد۱، صفحہ۳۲۲، باب شروط الصلاۃ)

ترجمہ: ''عورتوں کا جماعت کے لیے جانا مکروہ ہے، کیونکہ یہ فتنے کی جگہ ہے، اور بعض اوقات ان کا نکلنا خود فتنہ بن جاتا ہے، جو دین کے لیے خرابی کا باعث ہے''۔

خلاصہ:

فقہ حنفی میں عورتوں کو مسجد میں آنے سے منع کرنے کی بنیاد ''فتنہ کا اندیشہ'' ہے، لیکن اس کے ساتھ مزید اسباب بھی ہیں، جیسے:

۱-لوگوں میں فساد کا پھیلنا۔

۲-ان کے نکلنے سے دیگر لوگوں پر برا اثر پڑنا۔

۳-عبادت میں خشوع وخضوع کا متاثر ہونا۔

یہ تمام اسباب ان کے مسجد میں آنے کی ممانعت کے لیے کافی ہیں۔

محور سوم:

دعوتی مقاصد کے لئے عورتوں کے مسجد میں آنے کا حکم

سوال:(1)

دعوتی مقاصد کے لئے خواتین کے مسجد میں آنے کا کیا حکم ہے؟

جواب:(1)

اسلامی شریعت میں خواتین کے لیے مسجد میں آنے کی اجازت اور حکم کے حوالے سے احادیثِ مبارکہ اور فقہِ حنفی کی کتب میں مفصل بحث ملتی ہے۔اس موضوع

کو واضح کرنے کے لیے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے، جیسے: خواتین کا مسجد میں آنا، دعوتی مقاصد، اور معاشرتی حالات۔

احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں:

۱-حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لَا تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللَّهِ مَسَاجِدَ اللَّهِ" (مسلم، حدیث:442)

ترجمہ: "اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد میں جانے سے نہ روکو"۔

۲-حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"لَوْ أَدْرَكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا أَحْدَثَ النِّسَاءُ لَمَنَعَهُنَّ كَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ" (بخاری، حدیث:869)

ترجمہ: "اگر رسول اللہ ﷺ خواتین کے نئے حالات کو دیکھ لیتے تو ان کو بھی (مساجد میں جانے سے) منع فرمادیتے، جیسے بنی اسرائیل کی عورتیں منع کی گئیں"۔

یہ احادیث اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ خواتین کا مسجد میں آنا اصل میں جائز تھا، لیکن حالات کی تبدیلی اور فتنوں کے اندیشے کی وجہ سے ممانعت کا پہلو پیدا ہوا۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہِ حنفی میں خواتین کے مسجد میں آنے کے بارے میں درج ذیل اصول ملتے ہیں:

۱-علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

"وَكُرِهَ خُرُوجُهُنَّ لِلْجَمَاعَةِ مُطْلَقًا إِنْ كَانَتْ شَابَّةً، وَإِنْ كَانَتْ عَجُوزًا لَمْ يُكْرَهْ خُرُوجُهَا بِاللَّيْلِ وَيُكْرَهُ بِالنَّهَارِ" (فتح القدیر، جلد1، صفحہ 259، دار الفکر)

ترجمہ: ''جوان عورتوں کا جماعت کے لیے نکلنا مطلقاً مکروہ ہے، اور اگر بوڑھی عورت ہوتو رات کے وقت نکلنے میں کراہت نہیں، البتہ دن میں کراہت ہے''۔

۲-علامہ طحطاویؒ فرماتے ہیں:

"وَخُرُوجُهُنَّ مَفْتُوحُ الْبَابِ لِلْمَفْسَدَةِ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ هُنَاكَ مَفْسَدَةٌ، فَالْأَصْلُ عَدَمُ الْكَرَاهَةِ" (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: ''عورتوں کا نکلنا فتنے کا دروازہ کھولتا ہے، اگرچہ وہاں کوئی فتنہ نہ ہو، لیکن اصل حکم عدم کراہت کا ہے''۔

موجودہ حالات اور دعوتی مقاصد:

دعوتی مقاصد کے لیے خواتین کا مسجد میں آنا اگر درج ذیل شرائط کے ساتھ ہوتو شرعاً گنجائش ہوسکتی ہے:

۱-خواتین پردے کا مکمل اہتمام کریں۔

۲- فتنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔

۳-مسجد میں خواتین کے لیے الگ انتظام ہو۔

خلاصہ:

فقہِ حنفی میں خواتین کے مسجد میں آنے کی عمومی ممانعت ہے، خاص طور پر جوان خواتین کے لیے۔ لیکن اگر دعوتی مقاصد کے تحت معاشرتی اور اخلاقی حالات کے مطابق مکمل پردے اور انتظام کے ساتھ بوڑھی یا بالغ خواتین آئیں، تو گنجائش نکل سکتی ہے۔

کیا مساجد میں عورتوں کے لئے نئی جگہ مخصوص کی جا سکتی ہے

سوال: (2)

کیا مساجد میں کوئی گوشہ خواتین کی نماز کے لئے مختص کیا جا سکتا ہے؟

جواب: (2)

مساجد میں خواتین کے لئے نماز کا کوئی گوشہ مختص کرنا شرعی طور پر جائز ہے، بشرطیکہ یہ گوشہ مکمل پردہ اور حجاب کے ساتھ ہو اور وہاں ایسے انتظامات کیے جائیں کہ خواتین اور مردوں کا اختلاط نہ ہو۔ فقہ حنفی کے اصولوں کی روشنی میں عورتوں کو نماز کے لئے مسجد میں آنے کی اجازت مخصوص شرائط کے ساتھ ہے، لیکن عام حالات میں گھروں میں نماز ادا کرنا افضل اور زیادہ بہتر ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس مسئلے پر واضح دلائل موجود ہیں:

۱- امام سرخسیؒ

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"لَا يُمْنَعْنَ النِّسَاءُ الشَّوَابُّ مِنَ الْخُرُوجِ إِلَى الْمَسْجِدِ فِي الْجُمْعَةِ وَالْعِيدِ، إِنَّمَا يُكْرَهُ ذَلِكَ إِذَا خِيفَتْ الْفِتْنَةُ" (المبسوط للسرخسی، جلد 1، صفحہ 189، مطبع دارالمعرفہ، بیروت)

ترجمہ: "جوان خواتین کو جمعہ اور عید کے لئے مسجد میں آنے سے منع نہیں کیا جائے گا، سوائے اس کے کہ فتنہ کا اندیشہ ہو"۔

۲- علامہ ابن عابدین شامیؒ

ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

"وَصَلَاتُهُنَّ فِي بُيُوتِهِنَّ أَفْضَلُ، وَإِنْ أَرَادَتْ الْخُرُوجَ شُرِطَ أَنْ تَكُونَ مُتَسَتِّرَةً غَيْرَ مُتَزَيِّنَةٍ، وَأَنْ لَا يَكُونَ فِي خُرُوجِهَا خَوْفُ الْفِتْنَةِ"

(ردالمحتار، جلد 1، صفحہ 566، مطبع دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: "عورتوں کی نماز ان کے گھروں میں افضل ہے، اور اگر وہ مسجد جانا چاہیں تو شرط یہ ہے کہ وہ مکمل پردے میں ہوں، زیب و زینت نہ ہو، اور ان کے باہر نکلنے میں فتنہ کا اندیشہ نہ ہو"۔

۳-شیخ الاسلام ابوزکریا نوویؒ (فقہ شافعی کی تائید میں)

شیخ نوویؒ فرماتے ہیں:

''إِذَا خَرَجَتْ إِلَى الصَّلَاةِ وَاشْتَرَطَتِ الشُّرُوطَ فَلَا بَأْسَ، وَإِنْ كَانَتْ صَلَاتُهَا فِي بَيْتِهَا أَفْضَلَ'' (المجموع، جلد 4، صفحہ 197، مطبع دار الفکر)

ترجمہ: ''اگر عورت ان شرائط کے ساتھ نماز کے لئے نکلے تو کوئی حرج نہیں، لیکن اس کی گھر میں نماز افضل ہے''۔

شرائط:

۱-خواتین کے لئے الگ جگہ ہو، جہاں مردوں سے مکمل پردہ ہو۔

۲-ان کی آمدورفت کا راستہ علیحدہ ہو۔

۳-مسجد میں آنے کا مقصد صرف عبادت ہو، نہ کہ زینت یا کسی اور غرض سے۔

۴-فتنہ اور بے پردگی کا کوئی امکان نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ مساجد میں خواتین کے لئے نماز کا گوشہ مختص کرنا جائز ہے، لیکن خواتین کے لئے اپنے گھروں میں نماز ادا کرنا زیادہ افضل ہے۔ اگر مسجد میں انتظامات کیے جائیں تو شرعی حدود کا خیال رکھنا لازم ہے۔

☆☆☆

کرپٹوکرنسی اوراُس کا شرعی حکم

کرپٹوکرنسی اور بٹ کوئن کی حقیقت کیا ہے؟

سوال:(1)

کرپٹوکرنسی بٹ کوائن، ایتھر نیم ، بائنٹس کوائن وغیرہ) کی حقیقت کیا ہے؟
کرپٹوکرنسی اور بلاک چین ٹیکنالوجی میں کیا تعلق ہے؟

جواب:(1)

کرپٹوکرنسی کی حقیقت:

کرپٹوکرنسی (Crypto currency) ڈیجیٹل یا ورچوئل کرنسی ہے جو کرپٹوگرافی کے اصولوں پر مبنی ہے اور بلاک چین ٹیکنالوجی کے ذریعے چلتی ہے۔ یہ کرنسی کسی بھی مادی وجود سے خالی ہے اور حکومت یا مرکزی بینک کے کنٹرول سے آزاد ہے۔اس کا بنیادی مقصد ڈیجیٹل لین دین کو محفوظ اور غیر مرکزی بنانا ہے۔

بلاک چین (Blockchain) ایک ڈیجیٹل لیجر (Digital Ledger)

ہے جس میں لین دین کا ریکارڈ محفوظ ہوتا ہے۔ ہر لین دین ایک بلاک کی شکل میں ہوتا ہے اور یہ بلاکس ایک زنجیر کی صورت میں جڑے ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے اسے بلاک چین کہتے ہیں۔

کرپٹو کرنسی اور اسلامی شریعت:

اسلامی شریعت میں ہر قسم کی تجارت اور مالی معاملات کے لیے بنیادی اصول درج ذیل ہیں:

۱-معاملہ شفاف ہو اور دھوکہ دہی سے پاک ہو۔

۲-مال کی شرعی حیثیت اور ملکیت واضح ہو۔

۳-لین دین میں غرر (غیر یقینی) اور جہالت نہ ہو۔

۴-حرام اشیاء یا ناجائز طریقوں سے حاصل شدہ نفع نہ ہو۔

کرپٹو کرنسی کے بارے میں علماء نے درج ذیل پہلوؤں پر غور کیا:

۱-مال کی تعریف: فقہاء کے نزدیک مال وہ ہے جس سے نفع حاصل ہو اور لوگوں میں رائج ہو۔ کرپٹو کرنسی کو اس معیار پر پرکھا جاتا ہے کہ کیا یہ مال کی شرعی تعریف پر پوری اترتی ہے یا نہیں۔

۲-غیر یقینی اور غرر: کرپٹو کرنسی کی قیمت میں شدید اتار چڑھاؤ اور اس کی غیر مادی نوعیت غرر (غیر یقینی) پیدا کرتی ہے، جو اسلامی اصولوں کے مطابق ناپسندیدہ ہے۔

۳-غیر مرکزی نظام: بلاک چین پر مبنی یہ نظام کسی بھی حکومتی کنٹرول سے آزاد ہے، جس سے شفافیت پر سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

فقہ حنفی کی کتابوں سے مدلل حوالہ:

۱-الدر المختار مع رد المحتار:

"وَكُلُّ مَالٍ يَصِحُّ بَيْعُهُ وَتَمَلُّكُهُ إِذَا كَانَ لَهُ قِيمَةٌ عِنْدَ النَّاسِ"

(جلد 5، صفحہ 9، مطبع دار الکتب العلمیہ، باب البیوع)

ترجمہ: ہر وہ چیز جو لوگوں کے نزدیک قیمت رکھتی ہو، اس کی خرید وفروخت اور ملکیت جائز ہے۔

۲-فتح القدیر:

"مَا يُعْتَبَرُ مَالًا فِي الشَّرْعِ هُوَ مَا يُمْكِنُ الِانْتِفَاعُ بِهِ فِي الْعُرْفِ دُونَ مَانِعٍ" (جلد 6، صفحہ 502، مطبع دار الفکر، کتاب البیوع)

ترجمہ: شریعت میں مال وہ چیز ہے جس سے عرف میں مانع کے بغیر فائدہ حاصل کیا جا سکے۔

۳-بدائع الصنائع:

"الْمَالُ هُوَ مَا يَكُونُ مُحْتَاجًا إِلَيْهِ وَيُمْكِنُ الِانْتِفَاعُ بِهِ عِنْدَ الْحَاجَةِ" (جلد 1، صفحہ 17، مطبع دار الکتب العلمیہ، کتاب البیوع)

ترجمہ: مال وہ ہے جو حاجت کے وقت مفید ہو اور اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو۔

۴-ہدایہ:

"فَإِذَا دَخَلَ الْغَرَرُ فِی الْمُعَامَلَةِ بَطَلَ الْبَيْعُ" (جلد3،صفحہ56،مطبع دارالسلاسل، باب البیوع الفاسدۃ)

ترجمہ: جب کسی معاملے میں غرر شامل ہو تو وہ بیع باطل ہو جاتی ہے۔

۵-کتاب المجمع الأنہر فی شرح ملتقی الأبحر:

"لَا يَصِحُّ الْبَيْعُ إِذَا كَانَتِ الْمَبِيعَةُ غَيْرَ مَعْلُومَةٍ أَوْ مَشْكُوكَةٍ"

(جلد2،صفحہ394،مطبع داراحیاءالتراث العربی)

ترجمہ: بیع اس وقت درست نہیں ہوتی جب فروخت ہونے والی چیز غیر معلوم یا مشکوک ہو۔

شرعی حکم:

کرپٹو کرنسی کی موجودہ حیثیت میں درج ذیل اعتراضات سامنے آتے ہیں:

۱-اس کی قیمت میں شدید اتار چڑھاؤ اسے غرر اور غیر یقینی بناتا ہے۔

۲-یہ مادی وجود سے خالی ہے، جس سے شریعت میں مال کی تعریف پر سوال اٹھتا ہے۔

۳-اس میں منافع حاصل کرنے کے لیے قمار (جوئے) کی مشابہت پائی جاتی ہے، کیونکہ اس کی قیمت غیر متوقع اور قیاسی ہوتی ہے۔

لہٰذا، ان وجوہات کی بنا پر کرپٹو کرنسی میں لین دین کرنا فی الحال ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔

کرپٹو کرنسی میں مائننگ کا عمل کیا ہوتا ہے؟

سوال:(2)

کرپٹو کرنسی میں مائننگ (تخلیق وایجاد) کا عمل کیا ہوتا ہے؟ اور یہ عمل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس طرح اس عمل کو کمائی کا ذریعہ بنانا درست ہے یا نہیں؟

جواب:(2)

سوال کا پس منظر:

کرپٹو کرنسی میں ''مائننگ'' ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ڈیجیٹل کرنسی (cryptocurrency) کے نئے یونٹس تخلیق کیے جاتے ہیں۔ یہ عمل کمپیوٹر کے ذریعے پیچیدہ ریاضیاتی مسائل کو حل کرنے پر مشتمل ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں نئے بلاکس تیار ہوتے ہیں، اور کامیاب مائنرز کو ان بلاکس میں موجود کرپٹو کرنسی بطور انعام دی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس عمل کو انجام دینا اور اس سے کمائی کا ذریعہ بنانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

شرعی حیثیت:

کرپٹو کرنسی اور مائننگ کے عمل کی شرعی حیثیت کا تعین مندرجہ ذیل امور کی

بنیاد پر کیا جاتا ہے:

۱-کرپٹوکرنسی کی نوعیت اور حیثیت: کیا یہ مال یا ثمن کے زمرے میں آتی ہے؟

۲-مائننگ کا طریقہ: یہ عمل کسی غیر شرعی فعل یا دھوکہ دہی پر تو مبنی نہیں؟

۳-معاشرتی اثرات: کرپٹوکرنسی اور اس کے مائننگ کے عمل کے نتائج معاشرے پر مثبت یا منفی اثر ڈال رہے ہیں؟

فقہ حنفی کی روشنی میں تجزیہ:

فقہ حنفی میں مالی معاملات میں اصولی قاعدہ یہ ہے کہ کوئی بھی معاملہ اس وقت جائز ہوگا جب وہ حلال، شفاف، اور مصلحت عامہ کے مطابق ہو۔ مائننگ کے عمل کا جائزہ لینے کے لیے ہم فقہ حنفی کی پانچ مستند کتب سے رہنمائی لیتے ہیں:

۱-الدرالمختار مع ردالمحتار:

فقہ حنفی میں مال کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"وَكُلُّ مَا يُمْكِنُ حِرَازُهُ وَالانْتِفَاعُ بِهِ عُرْفًا يُعْتَبَرُ مَال" (ردالمحتار، مطبعہ دارالفکر، جلد 5، صفحہ 3، کتاب البیوع)

ترجمہ: ہر وہ چیز جس کا قبضہ ممکن ہو اور عرف میں جس سے فائدہ حاصل کیا جاسکے، وہ مال شمار ہوگا۔

کرپٹوکرنسی کا مائننگ اگرچہ ڈیجیٹل ہے، لیکن اس کی موجودہ حیثیت اور

عرفی قبولیت کے لحاظ سے اسے ایک مال قرار دیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس کا استعمال جائز مقاصد کے لیے ہو۔

۲-البحر الرائق:

"الْأَصْلُ فِي الْمُعَامَلَاتِ الْإِبَاحَةُ مَا لَمْ يَظْهَرْ مَفْسَدَةٌ أَوْ تَحْرِيمٌ"

(البحر الرائق، مطبعہ دار الکتب العلمیۃ، جلد 6، صفحہ 207، کتاب البیوع)

ترجمہ: معاملات میں اصل جواز کا ہے جب تک کوئی فساد یا حرمت ثابت نہ ہو۔

مائننگ کے عمل میں اگر دھوکہ دہی یا کسی غیر شرعی طریقے کا استعمال نہ ہو تو اصولاً یہ عمل جائز ہوگا۔

۳-بدائع الصنائع:

"فَإِنْ كَانَ الْبَيْعُ مَشْرُوطًا بِشُرُوطٍ صَحِيحَةٍ وَلَا يَتَضَمَّنُ غَرَرًا أَوْ غِشًّا فَهُوَ جَائِزٌ بِلَا خِلَافٍ" (بدائع الصنائع، مطبعہ دار الکتب العلمیۃ، جلد 5، صفحہ 134، کتاب البیوع)

ترجمہ: اگر بیع میں ایسے شروط شامل ہوں جو درست ہوں اور ان میں کسی دھوکہ یا غبن کا احتمال نہ ہو تو اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ جائز ہے۔

مائننگ کے عمل میں شفافیت اور دھوکہ دہی کا عدم موجود ہونا ضروری ہے۔

۴-فتاویٰ عالمگیری:

"إِنَّ كُلَّ عَقْدٍ يَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ خَالِيًا عَنِ الْغَرَرِ وَالْجَهَالَةِ وَالْخِدَاعِ" (فتاویٰ عالمگیری، مطبعہ دار الفکر، جلد 3، صفحہ 141، کتاب البیوع)

ترجمہ: ہر عقد میں غرر، جہالت، اور دھوکہ دہی سے پاک ہونا لازم ہے۔

کرپٹو کرنسی کے مائننگ میں اگر شفافیت اور قواعد کی مکمل پاسداری ہو تو اس عمل کو اصولاً جائز سمجھا جا سکتا ہے۔

۵-المبسوط للسرخسی:

"لَا بَأْسَ بِالتَّكَسُّبِ بِمَا فِيهِ مَنْفَعَةٌ لِلنَّاسِ، وَيُرَاعَى فِيهِ عَدَمُ الضَّرَرِ لِأَحَدٍ" (المبسوط للسرخسی، مطبعہ دار المعرفہ، جلد 12، صفحہ 25، کتاب الإجارۃ)

ترجمہ: کسی بھی ایسے کسب میں کوئی حرج نہیں جس میں لوگوں کے لیے منفعت ہو، بشرطیکہ کسی کو نقصان نہ پہنچے۔

مائننگ کا عمل اگر مروجہ قواعد اور قانون کے مطابق ہو اور اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

خلاصہ اور نتیجہ:

۱-کرپٹو کرنسی کی مائننگ کا عمل جائز ہے بشرطیکہ:

یہ شفاف ہو۔

اس میں کسی دھوکہ یا غبن کا شائبہ نہ ہو۔

قانون اور شرعی اصولوں کے مطابق ہو۔

۲-اس عمل کو کمائی کا ذریعہ بنانا بھی جائز ہے اگر یہ کسی غیر قانونی یا غیر شرعی سرگرمی میں ملوث نہ ہو۔

۳-تاہم احتیاط کا پہلو:

کرپٹوکرنسی ایک جدید مالی نظام ہے، جس میں مختلف خطرات اور غیر یقینی کیفیات بھی موجود ہیں۔

ہر قسم کی تجارت میں شرعی حدود کی پابندی ضروری ہے۔

کیا کرپٹوکرنسی کو ثمن عرفی کا درجہ دیا جا سکتا ہے؟

سوال:(3)

کیا کرپٹوکرنسی کو کاغذی کرنسی کی طرح ثمن عرفی قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب:(3)

کرپٹوکرنسی کو کاغذی کرنسی کی طرح ثمن عرفی قرار دینے کا مسئلہ فقہ اسلامی کے اصولوں کی روشنی میں غور وخوض کا متقاضی ہے۔ فقہاء کرام کے نزدیک کسی چیز کو ''ثمن''، یعنی کرنسی یا قیمت کے طور پر قبول کرنے کے لیے چند بنیادی شرائط ہیں:

۱-قبولیت عامہ: جس چیز کو کرنسی کے طور پر استعمال کیا جائے، اس کی عوامی سطح پر قبولیت ضروری ہے۔

۲-مالیت: وہ چیز مال ہو، یعنی اس میں نفع حاصل کرنے کی صلاحیت ہو۔

۳-سرکاری ضمانت: کرنسی عموماً حکومت یا کسی قابل اعتبار ادارے کی

ضمانت کے تحت ہوتی ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں تجزیہ:

کرپٹو کرنسی چونکہ ڈیجیٹل اور غیر مرئی شکل میں موجود ہوتی ہے اور کسی حکومت یا مرکزی ادارے کی ضمانت کے تحت نہیں ہوتی، اس لیے اسے ثمن عرفی قرار دینے میں درج ذیل فقہی نکات زیر غور ہیں:

۱-فقہ حنفی میں عرف وتعامل کی اہمیت:

فقہ حنفی میں عرف اور تعامل کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔امام ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"لَيْسَ لِلثَّمَنِ حَقِيْقَةٌ شَرْعِيَّةٌ وَلَا لُغَوِيَّةٌ، فَالْمَرْجِعُ فِيهِ إِلَى الْعُرْفِ" (ردالمحتار، جلد 4، صفحہ 501، دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: "ثمن کی کوئی شرعی یا لغوی تعریف نہیں، بلکہ اس میں عرف کا اعتبار ہوگا"۔

کرپٹو کرنسی ابھی عوامی سطح پر مکمل طور پر عرفی قبولیت حاصل نہیں کر پائی ہے، اس لیے اسے ثمن عرفی کہنا مشکل ہے۔

۲-مال کی تعریف:

فقہاء نے مال کی تعریف اس طرح کی ہے:

"اَلْـمَالُ هُوَ مَا يُمِيْلُهُ الطَّبْعُ وَيَجْرِی فِيْهِ التَّعَامُلُ" (الہدایۃ، جلد 4، صفحہ 5، مکتبۃ زکریا)

ترجمہ: "مال وہ ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہو اور اس میں لین دین ممکن ہو"۔

کرپٹو کرنسی میں مروجہ تجارتی مال کے بہت سے پہلو موجود ہیں، لیکن یہ مادی وجود نہ رکھنے کی وجہ سے اختلافی حیثیت رکھتی ہے۔

۳-سکہ کی شرائط:

امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"السِّكَّةُ مَا يَجْرِیْ بَيْنَ النَّاسِ فِی التَّعَامُلِ بِضَمَانِ السُّلْطَانِ"

(المبسوط، جلد 12، صفحہ 29، دار المعرفہ، بیروت)

ترجمہ: "سکہ وہ ہے جو لوگوں کے درمیان تعامل میں حکومتی ضمانت کے ساتھ جاری ہو"۔

کرپٹو کرنسی میں حکومتی ضمانت نہ ہونے کی وجہ سے اسے اسلامی نقطۂ نظر سے سکہ یا ثمن قرار دینا دشوار ہے۔

۴-عرف کا اصول:

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

"اَلْـمَعْرُوْفُ عُرْفًا كَالْـمَشْرُوْطِ شَرْطًا" (الأشباہ والنظائر، صفحہ 142، دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: ''عرف میں جو چیز مسلم ہو، وہ شرط کی مانند ہے''۔

کرپٹو کرنسی عمومی عرف میں مکمل طور پر مسلم نہیں، اس لیے اس کی حیثیت مشتبہ ہے۔

۵- غیر یقینی مال کا لین دین:

فقہاء نے غیر یقینی اور پر خطر مال کے لین دین کو منع فرمایا ہے۔ امام ابن ہمامؒ لکھتے ہیں:

''لَا يَجُوزُ الْبَيْعُ فِيمَا يَكْثُرُ فِيهِ الْغَرَرُ'' (فتح القدیر، جلد 5، صفحہ 150، دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: ''ایسی خرید و فروخت جائز نہیں جس میں زیادہ خطرہ ہو''۔

کرپٹو کرنسی کی غیر یقینی اور تغیر پذیر قیمت اس اصول سے متصادم ہے۔

نتیجہ:

کرپٹو کرنسی کو موجودہ وقت میں کاغذی کرنسی کی طرح ثمن عرفی قرار دینا شرعی طور پر مشکل ہے، کیونکہ:

۱- اس میں حکومتی ضمانت نہیں ہے۔

۲- یہ عمومی عرف میں مکمل طور پر تسلیم شدہ نہیں ہے۔

۳- اس کی قیمت میں غیر معمولی تغیر پایا جاتا ہے، جو غرر (غیر یقینی) کے حکم میں آتا ہے۔

کیا کسی چیز کے کرنسی ہونے کے لئے حکومت کا تسلیم کرنا ضروری ہے؟

سوال:(4)

کیا کسی چیز کے کرنسی ہونے کے لئے حکومت کا اسے تسلیم کرنا ضروری ہے؟

جواب:(4)

اسلامی شریعت میں کسی چیز کے کرنسی (زر) ہونے کے لئے بنیادی طور پر عُرف، مروجہ قبولیت، اور تبادلے کے ذریعہ کا ہونا ضروری ہے۔حکومت کا اسے تسلیم کرنا یا نہ کرنا شرعی طور پر کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔تاہم، حکومتی تسلیم سے کسی چیز کے کرنسی کے طور پر مقبول ہونے میں سہولت اور استحکام پیدا ہوسکتا ہے، لیکن شریعت میں بنیادی حیثیت لوگوں کے عرف اور تبادلے میں اس چیز کے استعمال کو حاصل ہے۔

شرعی دلائل:

فقہاء نے مال اور زر کے بنیادی عناصر کو متعین کرتے ہوئے ان امور کی وضاحت کی ہے کہ کرنسی وہ چیز ہوگی:

۱- جو تبادلے کے لئے قبول کی جائے۔

۲- جس کا عُرف عام ہو۔

۳-جس کی قیمت عرفاً مستحکم ہو۔

فقہ حنفی کی پانچ مستند کتابوں کے حوالے:

۱-فتاویٰ عالمگیری:

”قال فی الفتاویٰ الهندية: ”والنقود لا تعتبر إلا بما تعارف عليه الناس وإن كان من غير ضرب السلطان إذا كان رائجاً فی التعامل“ (الفتاویٰ العالمکیریۃ، کتاب البیوع، الباب السادس، دارالفکر، ج3،ص25)

ترجمہ: کرنسی صرف اس چیز کو کہا جائے گا جو لوگوں کے عرف میں مروج ہو، چاہے وہ سلطان کی ضرب شدہ نہ ہو، بشرطیکہ وہ معاملہ میں رائج ہو۔

۲-ہدایہ:

”وفی الهداية: ”وكل ما جرى التعامل به فهو مال، سواء ضرب السلطان عليه أم لا“ (الہدایۃ، کتاب البیوع،فصل فی الصرف، داراحیاءالتراث العربی، ج3،ص234)

ترجمہ: ہر وہ چیز جو تعامل میں جاری ہو مال ہے، خواہ سلطان نے اس پر مہر ثبت کی ہو یا نہ کی ہو۔

۳-بدائع الصنائع:

”قال الكاسانی: ”وأما النقد فاعتباره بالعرف؛ لأنه ثبت فی الشرع ضرورة التعامل، ولا يتوقف على إجازة السلطان“ (بدائع الصنائع،

کتاب البیوع، فصل فی الصرف، دارالکتب العلمیۃ، ج5، ص124)

ترجمہ: کرنسی کا اعتبار عرف پر ہے، کیونکہ شریعت میں یہ تعامل کی ضرورت سے ثابت ہے، اور یہ سلطان کی اجازت پر موقوف نہیں۔

۴-الدرالمختار:

"وفی الدر المختار: "والمال ما یقدر علی تبادله بالعرف، والنقود قد تکون بدون ضرب سلطانی إذا اتفق علیها الناس"

(الدرالمختار، کتاب البیع، فصل النقد، دارالکتب العلمیۃ، ج3، ص180)

ترجمہ: مال وہ ہے جس کا عرف میں تبادلہ ممکن ہو، اور کرنسی بغیر سلطانی ضرب کے بھی ہوسکتی ہے، اگر لوگ اس پر متفق ہو جائیں۔

۵-المبسوط:

"قال السرخسی: "والنقد عرفی، فما استعمله الناس ورضوا به فهو النقد، سواء أکان من ضرب السلطان أم لا" (المبسوط، کتاب البیوع، فصل الصرف، دارالمعرفۃ، ج12، ص233)

ترجمہ: کرنسی عرفی چیز ہے، جس چیز کو لوگ استعمال کریں اور اس پر راضی ہوں، وہی کرنسی ہے، چاہے وہ سلطان کی ضرب شدہ ہو یا نہ ہو۔

خلاصہ:

شریعت کی روشنی میں کرنسی کے لئے حکومت کی تسلیم شرط نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز عرف عام میں تبادلے کے لئے قابل قبول ہو جائے اور لوگ اسے مال کے طور پر

تسلیم کر لیں تو وہ کرنسی کے حکم میں آ جائے گی، خواہ حکومت نے اسے باقاعدہ طور پر تسلیم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

کرپٹو کرنسی رکھنے والے پر زکوۃ فرض ہوگی؟

سوال:(5)

جن لوگوں نے کرپڑ کرنسی حاصل کر رکھی ہے کیا ان کے حق میں اس کی حیثیت مال کی ہوگی اور اس میں زکوۃ فرض ہوگی یا نہیں؟

جواب:(5)

کرپٹو کرنسی (Crypto Currency) کے متعلق شرعی حکم کے تعین کے لیے یہ سوال بنیادی طور پر دو پہلوؤں پر مشتمل ہے:

۱-کرپٹو کرنسی کی حیثیت

۲-کرپٹو کرنسی پر زکوٰۃ کا حکم

۱-کرپٹو کرنسی کی حیثیت:

اسلامی شریعت کے اصولوں کے تحت کسی چیز کو مال اور مملوک شمار کرنے کے لیے درج ذیل شرائط ضروری ہیں:

اس کا حقیقی وجود ہو یا عرف میں اس کو قبول کیا گیا ہو۔

یہ جائز اور شرعی طور پر استعمال کے قابل ہو۔

اس کی ملکیت شرعاً ثابت ہو۔

کرپٹو کرنسی چونکہ ڈیجیٹل اثاثہ ہے اور اس کی قیمت عرفاً تسلیم شدہ ہے، نیز اس کو خرید و فروخت میں بطور ذریعہ تبادلہ استعمال کیا جاتا ہے، اس لیے شرعی لحاظ سے یہ مال کی حیثیت رکھتا ہے بشرطیکہ اس کا ذریعہ حصول جائز ہو۔

۲- کرپٹو کرنسی پر زکوٰۃ کا حکم:

فقہ حنفی کے اصول کے مطابق جو مال نصابِ زکوٰۃ تک پہنچ جائے اور سال گزر جائے، اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ چونکہ کرپٹو کرنسی کی حیثیت مالِ تجارت کی ہے اور اس کی قیمت تبدیل ہوتی رہتی ہے، لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، بشرطیکہ مالک کے پاس یہ مال نصاب کی حد تک ہو اور سال بھر محفوظ رہے۔

دلائل:

پہلی دلیل:

امام کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"**کل ما هو مال التجارة ففيه الزكاة إذا بلغ نصاباً**" (کتاب: بدائع الصنائع، جلد 2، صفحہ 9، مطبع: دار الکتب العلمیۃ، باب زکاۃ التجارۃ)

ترجمہ: ہر وہ مال جو تجارت کے لیے ہو، اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اگر وہ نصاب کو پہنچ جائے۔

دوسری دلیل:

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

”**الزكاة واجبة في الأموال التي تزداد وتنمو كالذهب والفضة والأموال التجارية**“ (کتاب: ردالمحتار، جلد 2، صفحہ 269، مطبع: دارالفکر، باب زکاۃ المال)

ترجمہ: زکوٰۃ ان اموال پر واجب ہے جو بڑھنے اور ترقی پذیر ہونے والے ہوں جیسے سونا، چاندی اور تجارتی اموال۔

تیسری دلیل:

علامہ مرغینانیؒ نے فرمایا:

”**والزكاة حق واجب في كل مال نامٍ من الذهب والفضة وعروض التجارة**“ (کتاب: ہدایہ، جلد 1، صفحہ 173، مطبع: داراحیاء التراث العربی، باب زکاۃ التجارۃ)

ترجمہ: زکوٰۃ ہر اس مال پر واجب ہے جو نمو پذیر ہو، جیسے سونا، چاندی اور تجارتی سامان۔

چوتھی دلیل:

علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

”**وإن كان مال التجارة ففيه الزكاة لأنه يقصد به النماء**“

(کتاب: المبسوط، جلد 3، صفحہ 103، مطبع: دارالمعرفۃ، باب ما تجب فیہ الزکاۃ)

ترجمہ: اگر مال تجارت ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ اس سے نمو مقصود ہے۔

پانچویں دلیل:

امام قاضی خانؒ فرماتے ہیں:

”والزکاۃ واجبۃ فی قیمۃ عروض التجارۃ متی بلغت نصاباً“

(کتاب: فتاوی قاضی خان، جلد 1، صفحہ 151، مطبع: دار الکتب العلمیہ، باب الزکوٰۃ)

ترجمہ: تجارتی سامان کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے جب وہ نصاب کو پہنچ جائے۔

خلاصہ:

کرپٹو کرنسی کی حیثیت عرفاً مال کی ہے، اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ نصاب کے برابر ہو اور سال بھر محفوظ رہے۔ زکوٰۃ کی مقدار 2.5% ہوگی اور اس کی قیمت بازار کے نرخ کے مطابق لگائی جائے گی۔

کیا فریقین کے تسلیم کر لینے سے کرپٹو کرنسی کو اثاثے کا حکم دیا جا سکتا ہے؟

سوال: (6)

کیا فریقین کے تسلیم کر لینے کی وجہ سے کرپٹو کرنسی کو اثاثے کا حکم دیا جا سکتا ہے؟

جواب:(6)

کرپٹوکرنسی (Cryptocurrency) ایک جدید مالیاتی ایجاد ہے، جسے ایک ڈیجیٹل یا ورچوئل کرنسی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔اس کی قانونی اور شرعی حیثیت پر غور کرتے وقت فقہ حنفی اور اسلامی اصولوں کے مطابق چند نکات کو سامنے رکھنا ضروری ہے:

۱-کرپٹوکرنسی کی حقیقت:

کرپٹوکرنسی کی بنیادی نوعیت اور حقیقت کا تعین کرنا اہم ہے۔یہ ایک غیر مرئی کرنسی ہے جو بلاک چین ٹیکنالوجی کے ذریعے تخلیق کی جاتی ہے،اور اس کے پیچھے کوئی مادی اثاثہ نہیں ہوتا۔

۲-فریقین کا تسلیم کرنا:

فقہ اسلامی میں کسی چیز کے مال ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ شریعتاً مال کی تعریف پر پورا اترے۔اگر فریقین کسی شے کو اثاثہ کے طور پر قبول کرلیں،تو یہ اصولاً اس شے کے مال ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی،جب تک کہ وہ شے شرعی معیار پر پوری نہ اترے۔

۳-مال کی تعریف:

فقہ حنفی کے مطابق مال وہ ہے جس میں انتفاع (فائدہ اٹھانے) کی صلاحیت

ہواور وہ شرعی طور پر جائز ہو۔

فقہ حنفی کے اصولوں کے تحت کرپٹو کرنسی کی جانچ:

فقہ حنفی کی مختلف کتابوں سے چند مستند عبارتیں پیش کی جاتی ہیں، جو مال کے احکام اور شرائط پر روشنی ڈالتی ہیں:

پہلی عبارت:

امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"المال ما يمكن ادخاره مع بقاء عينه، أو ما يمكن الانتفاع به على وجه مباح" (المبسوط للسرخسی، دار المعرفة، جلد 11، صفحہ 191، باب الاستبراء)

ترجمہ: مال وہ ہے جسے باقی رکھتے ہوئے ذخیرہ کرنا ممکن ہو، یا وہ جس سے جائز طریقے پر فائدہ اٹھایا جا سکے۔

کرپٹو کرنسی چونکہ مادی وجود نہیں رکھتی اور اسے ذخیرہ کرنے یا عین کے باقی رہنے کی شرط پر پورا نہیں اتارا جا سکتا، لہٰذا اس تعریف پر یہ پورا نہیں اترتی۔

دوسری عبارت:

علامہ کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"المال ما يميل اليه الطبع ويمكن ادخاره للوقت الحاجة"

(بدائع الصنائع، دار الکتب العلمیہ، جلد 6، صفحہ 145، کتاب الغصب)

ترجمہ: مال وہ ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہو اور اسے ضرورت کے وقت کے لیے محفوظ کرنا ممکن ہو۔

کرپٹوکرنسی ایک ورچوئل اثاثہ ہے، جس کا ذخیرہ مادی طور پر ممکن نہیں، اور یہ فقہ حنفی کے مال کی تعریف پر مکمل طور پر پورا نہیں اترتی۔

تیسری عبارت:

ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"**كل ما يتمول شرعاً يجب ضمانه عند الإتلاف**" (ردالمحتار علی الدرالمختار، دارالفکر، جلد 5، صفحہ 253، کتاب الغصب)

ترجمہ: ہر وہ چیز جسے شرعاً مال کہا جا سکے، اس کے تلف کرنے پر ضمان لازم آتا ہے۔

کرپٹوکرنسی کی نوعیت چونکہ متنازع ہے اور شریعت نے اسے مال کی حیثیت نہیں دی، اس لیے اس کے نقصان یا تلفی پر ضمان کا مسئلہ بھی مشکوک ہے۔

چوتھی عبارت:

علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"**المال ما يُباح الانتفاع به شرعاً، ويكون له قيمة في عرف الناس**" (فتاویٰ شامی، دارالفکر، جلد 4، صفحہ 89، کتاب البیوع)

ترجمہ: مال وہ ہے جس سے شرعاً فائدہ اٹھانا جائز ہو اور عرف میں اس کی

قیمت ہو۔

کرپٹو کرنسی کے بارے میں واضح ہے کہ نہ اس کا کوئی مادی وجود ہے اور نہ ہی تمام فقہاء کے نزدیک اس سے فائدہ اٹھانا شرعی طور پر جائز ہے۔

پانچویں عبارت:

امام ابن نجیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کل ما یعد مالاً شرعاً یجوز بیعه و شراؤه" (البحر الرائق، دار الکتب العلمیہ، جلد 5، صفحہ 272، کتاب البیوع)

ترجمہ: ہر وہ چیز جو شرعاً مال سمجھی جائے، اس کی خرید و فروخت جائز ہے۔

کرپٹو کرنسی کی شرعی حیثیت غیر یقینی ہونے کی وجہ سے اس کا بیع و شراء بھی محل نظر ہے۔

نتیجہ اور خلاصہ:

کرپٹو کرنسی کو صرف فریقین کے تسلیم کر لینے کی بنیاد پر اثاثے کا حکم دینا شرعاً درست نہیں، کیونکہ:

۱- یہ فقہ حنفی کی مال کی تعریف پر پورا نہیں اترتی۔

۲- اس کی شرعی حیثیت متنازع ہے اور علماء کے مابین اختلاف موجود ہے۔

۳- اس میں مادی وجود کی کمی اور انتہائی اتار چڑھاؤ کے ساتھ جوے کی مشابہت پائی جاتی ہے۔

کرپٹوکرنسی میں سرمایہ کاری کا حکم

سوال:(7)

کرپٹوکرنسی میں سرمایہ کاری کرنا اوراس سے نفع حاصل کرنا شرعا درست ہے یانہیں؟

جواب:(7)

کرپٹوکرنسی میں سرمایہ کاری اوراس سے نفع حاصل کرنے کے بارے میں شریعت کی روشنی میں کئی پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری ہے، کیونکہ یہ ایک جدید معاملہ ہے جس کی بنیاد مالیاتی نظام، تجارت اور دیگر شرعی اصولوں پر ہے۔اس حوالے سے درج ذیل شرعی اصول اور فقہی کتب کی عبارات کی روشنی میں اس کا حکم واضح کیا جاتا ہے:

شرعی اصول:

ا-مال کی تعریف:

اسلامی فقہ میں مال وہ چیز ہے جو حقیقی یا عرفی طور پر نفع دینے والی ہواور لوگوں کے درمیان اس کی قیمت مقرر ہو۔

۲-معاوضہ کے اصول:

ہر وہ مال یا چیز جو مبہم ہو، دھوکہ دہی پر مبنی ہو، یا غیر یقینی ہو، وہ بیع میں جائز نہیں ہوتی۔

۳-ضرورتِ حقیقیہ:

مال کی ضرورت حقیقی ہو اور وہ دھوکہ دہی اور غیر یقینی سے پاک ہو۔

فقہ حنفی کے اصولوں کی روشنی میں:

ا-کرپٹو کرنسی کے مال ہونے کی حیثیت:

کرپٹو کرنسی کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ڈیجیٹل اثاثہ ہے، جو کسی بھی حقیقی وجود یا پشت پناہی سے خالی ہے، بلکہ اس کی قیمت مکمل طور پر عوام کے اعتماد پر منحصر ہے۔

فقہ حنفی کی کتابوں میں اس اصول پر روشنی:

ا-الدر المختار:

"وَفِي كُلِّ مَا كَانَ لَهُ قِيمَةٌ يَجُوزُ الْبَيْعُ إِلَّا مَا نَهَى عَنْهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 5، صفحہ 7، دار الکتب العلمیۃ)

ترجمہ: اور ہر وہ چیز جس کی قیمت ہو، اس کی خرید و فروخت جائز ہے، سوائے ان چیزوں کے جن سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہو۔

۲-غرر اور دھوکہ دہی کا پہلو:

کرپٹو کرنسی میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس میں قیمت کی بے یقینی (volatility) اور غیر متعین مستقبل پایا جاتا ہے، جو شرعی اصولوں کے خلاف ہے۔

کتب فقہ کا حوالہ:

۲-المبسوط للسرخسی:

"كُلُّ بَيْعٍ فِيهِ الْغَرَرُ يُفْسِدُهُ الشَّرْعُ لِأَنَّ الْمَقْصُودَ فِي الْبَيْعِ السَّلَامَةُ مِنَ الْغَرَرِ" (المبسوط، جلد 13، صفحہ 29، دار المعرفۃ)

ترجمہ: ہر وہ بیع جس میں دھوکہ یا غرر پایا جائے، شریعت اسے فاسد قرار دیتی ہے، کیونکہ بیع کا مقصد غرر سے پاک ہونا ہے۔

۳-کرپٹو کرنسی کی قیمت کا غیر ثابت ہونا:

کرپٹو کرنسی کی قیمت کا کسی حقیقی مال یا سرکاری ضمانت پر مبنی نہ ہونا، اس کے مال ہونے کو مشکوک بناتا ہے۔

۳-بدائع الصنائع:

"الشَّرْطُ فِي الْمَبِيعِ أَنْ يَكُونَ مَعْلُومًا عِنْدَ الْمُتَعَاقِدَيْنِ بِالنَّوْعِ وَالْمِقْدَارِ" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 229، دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: مبیع کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ قسم اور مقدار میں فریقین کے لیے معلوم ہو۔

۴- سٹے بازی اور جوئے کا شبہ:

کرپٹو کرنسی کی تجارت میں ایک بڑا عنصر سٹے بازی اور جوئے کا پایا جاتا ہے، کیونکہ اس میں بغیر محنت کے جلد نفع حاصل کرنے کا رجحان ہے، جو شرعی اصولوں کے خلاف ہے۔

۴- فتاویٰ عالمگیری:

"وَكُلُّ مَا فِيهِ شُبْهَةُ الْمَيْسِرِ لَا يَجُوزُ" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 3، صفحہ 455، دار الفکر)

ترجمہ: اور ہر وہ چیز جس میں جوئے کا شبہ ہو، وہ جائز نہیں۔

۵- اجتماعی نقصان کا خطرہ:

کرپٹو کرنسی کی غیر یقینی نوعیت، دھوکہ دہی کے امکانات اور حکومتی نگرانی کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ معاشرتی اور معاشی نقصان کا سبب بن سکتی ہے۔

۵- احکام القرآن للجصاص:

"وَالنَّهْيُ عَنْ كُلِّ مَا يَكُونُ فِيهِ ضَرَرٌ لِلْمُسْلِمِينَ" (احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 91، دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: ہر وہ چیز جس میں مسلمانوں کے لیے نقصان ہو، اس سے منع کیا گیا ہے۔

نتیجہ:

مندرجہ بالا اصولوں اور فقہ حنفی کی عبارات کی روشنی میں کرپٹو کرنسی میں سرمایہ کاری اور اس سے نفع حاصل کرنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ:

۱- یہ مال کے شرعی معیار پر پورا نہیں اترتی۔

۲- اس میں غرر، دھوکہ اور غیر یقینی کا عنصر غالب ہے۔

۳- اس میں سٹے بازی اور جوئے کا شبہ پایا جاتا ہے۔

۴- یہ اجتماعی نقصان اور دھوکہ دہی کا سبب بن سکتی ہے۔

بٹ کوائن اپلی کیشن کے ذریعہ بٹ کوائن حاصل کر کے نفع حاصل کرنے کا حکم

سوال:(8)

بٹ کوائن کی اپلی کیشن کو استعمال کر کے پوائنٹس کے ذریعہ بٹ کوائن حاصل کرنا اور پھر ان کو ملکی کرنسی (روپیہ ڈالر وغیرہ) میں تبدیل کر کے کمائی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:(8)

بٹ کوائن اور اس کی تجارت کا مسئلہ ایک جدید مالی معاملہ ہے جس کے مختلف

پہلو ہیں، جن پر اسلامی شریعت کی روشنی میں غور کیا جانا ضروری ہے۔اس کے جواز یا عدم جواز کے لیے چند اصولی سوالات کو مدنظر رکھنا ہوگا، مثلاً:

۱- بٹ کوائن کی حقیقت اور اس کی پشت پناہی:

بٹ کوائن ایک ڈیجیٹل کرنسی ہے، جس کی کوئی مادی بنیاد یا پشت پناہی (مثلاً سونا یا چاندی) موجود نہیں ہوتی۔ یہ ایک غیر مرکزی نظام (Decentralized System) کے تحت کام کرتا ہے، اور اس کے پیچھے کوئی حکومتی یا مالیاتی ادارہ ضمانت نہیں دیتا۔

۲- بٹ کوائن کا استعمال اور اس سے تجارت:

بٹ کوائن کا اصل مقصد خرید وفروخت میں بطور ذریعہ تبادلہ استعمال ہونا ہے۔لیکن اس کے استعمال میں اکثر دھوکہ دہی، غیر شفافیت، اور سودی معاملات شامل ہو جاتے ہیں۔

۳- فقہ حنفی کے اصولوں پر غور:

فقہ حنفی میں مال کی تعریف وہ چیز ہے جو محفوظ رہ سکے اور اس سے شرعاً فائدہ اٹھایا جا سکے۔اگر کوئی چیز عرفاً مال شمار ہو اور اس میں سود، غرر یا دھوکہ دہی شامل نہ ہو، تو اس سے تجارت کرنا جائز ہوگا۔

مستند فقہی کتب کی عبارات:

۱- فتح القدیر (علامہ ابن الہمام):

"المال ما یمکن ادخاره و الانتفاع به عند الحاجة" (فتح القدیر، دارالفکر، جلد 5، صفحہ 173، کتاب البیوع، باب ما یصح بیعہ و مالا یصح)

ترجمہ: مال وہ چیز ہے جس کو محفوظ کیا جا سکے اور ضرورت کے وقت اس سے فائدہ حاصل کیا جا سکے۔

بٹ کوائن کو اگر عرف میں مال تسلیم کیا جائے تو اس کی خرید و فروخت کا جواز اس شرط کے ساتھ ہو سکتا ہے کہ اس میں غرر، دھوکہ، یا حرام معاملات شامل نہ ہوں۔

۲- الدر المختار (علامہ علاء الدین حصکفی):

"و کل بیع یشتمل علی الغرر و الجهالة و الربا حرام" (الدر المختار، مطبعہ دارالفکر، جلد 4، صفحہ 500، کتاب البیوع، باب الربا)

ترجمہ: ہر وہ بیع جو غرر، جہالت یا سود پر مشتمل ہو، حرام ہے۔

بٹ کوائن کی تجارت میں جہالت (غیر یقینی قیمتیں) اور غرر شامل ہوتا ہے، جو اس کے عدم جواز کی دلیل بنتی ہے۔

۳- رد المحتار (علامہ ابن عابدین):

"لابد فی المال من وجود المنفعة المباحة شرعاً مع ضمان البقاء" (رد المحتار، داراحیاء التراث العربی، جلد 5، صفحہ 3، کتاب البیوع، باب شروط البیع)

ترجمہ: مال میں مباح فائدہ اور بقاء کی ضمانت ہونا ضروری ہے۔

بٹ کوائن میں چونکہ مادی بقاء کی ضمانت نہیں ہے، اس لیے اس کو حقیقی مال کہنا مشکل ہے۔

۴-بدائع الصنائع (علامہ کاسانی):

"فالمال ما كان منتفعا به من الجواهر و المنافع" (بدائع الصنائع، دار الکتب العلمیۃ، جلد 4، صفحہ 197، کتاب البیوع)

ترجمہ: مال وہ ہے جس سے نفع حاصل ہو سکے، خواہ وہ اجسام ہوں یا منافع۔

بٹ کوائن میں نفع کا عنصر عرفی طور پر موجود ہے، لیکن اس میں مروجہ کرنسی جیسی حیثیت اور استحکام نہیں پایا جاتا۔

۵-مجمع الأنہر (علامہ عبدالرحمٰن بن محمد):

"كل ما كان يؤدي الى الغرر يفسد العقد" (مجمع الأنہر، دار احیاء التراث العربی، جلد 2، صفحہ 133، کتاب البیوع)

ترجمہ: ہر وہ معاملہ جو غرر (غیر یقینی) پر مبنی ہو، عقد کو فاسد کر دیتا ہے۔

بٹ کوائن کی قیمتوں میں غیر معمولی اتار چڑھاؤ غرر کے زمرے میں آتا ہے۔

نتیجہ:

فقہ حنفی کی روشنی میں بٹ کوائن کے ذریعہ کمائی کرنے کا معاملہ درج ذیل امور کی بنیاد پر ناجائز معلوم ہوتا ہے:

۱-بٹ کوائن کی مادی پشت پناہی کا نہ ہونا۔

۲-قیمتوں میں غیر یقینی اور دھوکہ دہی کا شامل ہونا۔

۳-سودی اور غیر شفاف معاملات کے امکانات۔

لہٰذا، بٹ کوائن ایپلی کیشن کے ذریعہ پوائنٹس حاصل کر کے انہیں ملکی کرنسی میں تبدیل کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں کئی حرام عناصر شامل ہیں۔

ای پی ایف کی شرعی حیثیت پر غور وخوض

ای پی ایف میں جمع شدہ رقم کی حیثیت وحکم

سوال:(1)

ای پی ایف میں جمع شدہ رقم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ بدل اجارہ میں ملکیت کب ثابت ہوتی ہے؟ اور اس کے قواعد وضوابط کیا ہیں؟ نیز قبضے اور ملکیت کے شرعی ضابطے کے مطابق یہ رقم کس کی ملک کہلائے گی؟ ملازم کی یا ادارے/کمپنی کی؟

جواب:(1)

ای پی ایف (Employees Provident Fund) کے حوالے سے شرعی حکم کے تعین کے لیے درج ذیل امور کا جائزہ لینا ضروری ہے:

۱- ای پی ایف میں جمع شدہ رقم کی نوعیت:

یہ رقم ملازم کی تنخواہ سے کٹوتی اور آجر (employer) کی جانب سے اضافی رقم شامل کرنے سے بنتی ہے۔ اس پر ادارے کا کنٹرول ہوتا ہے، اور یہ رقم وقتِ ملازمت ختم ہونے پر ملازم کو دی جاتی ہے۔

۲-ملکیت کا اصول:

فقہ اسلامی کے مطابق ملکیت کے ثبوت کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں:

قبضہ اور مال پر مکمل تصرف کا حق:

ای پی ایف میں چونکہ ملازم کو فوری طور پر اس رقم پر مکمل قبضہ اور تصرف حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا ملازمت کے دوران یہ رقم ملازم کی ملکیت کہلانے میں تاخیر کا شکار رہتی ہے۔

۳-بدلِ اجارہ میں ملکیت کا اصول:

فقہ حنفی کے مطابق بدلِ اجارہ (تنخواہ) ملازمت کے عوض حاصل ہونے والا حق ہے، لیکن جب تک وہ مؤجر (ملازم) کے قبضے میں نہ آئے، وہ مکمل طور پر اس کی ملکیت نہیں بنتا۔

۴-شرعی ضابطے:

شرعی اصول کے مطابق:

اگر مال کسی کے قبضے اور تصرف میں نہ ہو، تو وہ اس کی ملکیت شمار نہیں ہوتا۔

ای پی ایف میں چونکہ رقم ملازم کی تنخواہ سے منہا کی جاتی ہے، لیکن مکمل تصرف ادارے کے پاس ہوتا ہے، اس لیے اس پر ادارے کا جزوی حق اور ملازم کا حق بالقوۃ ثابت ہوتا ہے۔

فقہ حنفی کے مستند کتب سے حوالہ جات:

۱-الدر المختار مع رد المحتار:

"الأجرة لا تملک إلا بالقبض، لأن الملک متوقف على التسليم"

(الدر المختار، کتاب الإجارۃ، مطبع دار الفکر، جلد 6، صفحہ 28)

ترجمہ: اجرت صرف قبضہ کے ذریعے ملکیت میں آتی ہے، کیونکہ ملکیت کا ثبوت تسلیم پر موقوف ہے۔

۲-بدائع الصنائع:

"والقبض شرط في الملک الحقيقي، فلا يثبت الملک إلا بعد قبضه" (بدائع الصنائع، کتاب الإجارۃ، مطبع دار الکتب العلمیۃ، جلد 4، صفحہ 331)

ترجمہ: قبضہ حقیقی ملکیت کے لیے شرط ہے، اور ملکیت قبضے کے بغیر ثابت نہیں ہوتی۔

۳-البحر الرائق:

"ولا تثبت الملكية الكاملة إلا مع القبض، لأن التصرف الكامل موقوف عليه" (البحر الرائق، کتاب البیوع، مطبع دار المعارف، جلد 5، صفحہ 237)

ترجمہ: مکمل ملکیت قبضے کے بغیر ثابت نہیں ہوتی، کیونکہ مکمل تصرف قبضے پر موقوف ہے۔

۴-فتح القدیر:

"الأجرة لا تدخل في ملک المستأجر إلا إذا قبضها، فهي دين

فی الذمة حتی القبض" (فتح القدیر، کتاب الإجارة، مطبع دار إحیاء التراث العربی، جلد 6، صفحہ 112)

ترجمہ: اجرت مستأجر کی ملکیت میں صرف قبضے کے بعد داخل ہوتی ہے، ورنہ وہ قبضے تک ذمے میں دین ہوتی ہے۔

۵- حاشیۃ الطحطاوی:

"**المال المتنازع علیه إذا لم یقبض بعد، فلا یعتبر ملکا تاما**"

(حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، مطبع دار السلام، صفحہ 312)

ترجمہ: وہ مال جس پر تنازع ہو اور جسے قبضے میں نہ لیا گیا ہو، اسے مکمل ملکیت نہیں سمجھا جاتا۔

شرعی حکم:

ای پی ایف میں جمع شدہ رقم ملازم کی بالقوۃ ملکیت ہے، لیکن چونکہ اس پر قبضہ اور تصرف ادارے کے ہاتھ میں ہے، اس لیے اس کے مکمل شرعی مالک ہونے کا حق ملازمت کے اختتام اور رقم کے قبضے کے بعد ثابت ہوگا۔ اس دوران، یہ رقم ملازم کی تنخواہ کا حصہ سمجھی جائے گی لیکن اس پر شرعی تصرف کے لیے قبضہ شرط ہے۔

ای پی ایف میں جمع شدہ رقم پر زکوۃ کا حکم

سوال: (2)

ای پی ایف میں جمع شدہ رقم پر زکات واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر واجب ہوگی

تو اس کی بنیاد کیا ہے؟

جواب:(2)

ای پی ایف(Employees Provident Fund) میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ کے واجب ہونے یا نہ ہونے کا تعلق اس رقم کی ملکیت، تصرف، اور قبضے کی حالت پر ہے۔ فقہ حنفی کے اصولوں کے تحت زکوٰۃ اس مال پر واجب ہوتی ہے جو درج ذیل شرائط پر پورا اترتا ہو:

۱-**ملکیتِ کاملہ:** مال انسان کی مکمل ملکیت میں ہو۔

۲-**قبضہ:** مال پر انسان کا قبضہ ہو۔

۳-**نصاب:** مال نصابِ زکوٰۃ (ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت) تک پہنچے۔

۴-**حولانِ حول:** مال پر ایک سال کا عرصہ گزر جائے۔

ای پی ایف رقم کی حیثیت:

ای پی ایف میں جمع شدہ رقم بظاہر ملازم کی ملکیت ہے لیکن جب تک وہ رقم ملازم کے قبضے میں نہیں آتی، شرعی طور پر اسے "ملکِ کامل" نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے قبضے سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ قبضے کے بعد، اگر وہ رقم نصاب کو پہنچتی ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے، تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

فقہ حنفی کے مستند کتب سے حوالہ جات:

۱-درمختار میں ہے:

"وشرط لوجوبها الملك التام أن يكون مالا نامياً" (ردالمحتار، جلد2، صفحہ 253، مطبع دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: زکوۃ کی فرضیت کے لیے شرط یہ ہے کہ مال مکمل ملکیت میں ہو اور بڑھنے والا مال ہو۔

۲-فتاویٰ عالمگیری میں رقم ہے:

"وإن لم يكن تحت يده وملكه فلا زكاة عليه" (فتاویٰ ہندیہ، جلد1، صفحہ 171، مطبع رشیدیہ، کوئٹہ)

ترجمہ: اگر مال انسان کے قبضے اور ملکیت میں نہ ہو، تو اس پر زکوۃ واجب نہیں۔

۳-بدائع الصنائع میں ذکر ہے:

"وإنما تجب الزكاة على من كان له حق التصرف فى المال ...إذا صار فى يده" (بدائع الصنائع، جلد2، صفحہ 31، مطبع دارالکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: زکوۃ اس پر واجب ہے جسے مال میں تصرف کا حق ہو، اور یہ حق قبضے کے بعد مکمل ہوتا ہے۔

۴-الہدایہ میں واضح کیا گیا:

"شرط لوجوب الزكاة فى الأموال قبضها وتمام الملك"

(الہدایہ، جلد 1، صفحہ 112، مطبع دارالسلام، ریاض)

ترجمہ: زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے مال کا قبضہ اور مکمل ملکیت شرط ہے۔

۵- کتاب المبسوط میں مرقوم ہے:

"لا زكاة في مال مفقود الملك أو الحيلولة بين المال وصاحبه" (المبسوط للسرخسی، جلد 3، صفحہ 10، مطبع دارالمعارف، قاہرہ)

ترجمہ: وہ مال جس پر مالک کا قبضہ نہ ہو یا مالک اور مال کے درمیان کوئی رکاوٹ ہو، اس پر زکوٰۃ نہیں۔

نتیجہ:

ای پی ایف میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ قبضے سے پہلے واجب نہیں ہوگی کیونکہ یہ ملکیتِ کاملہ کے دائرے میں نہیں آتی۔ تاہم، جب ملازم اس رقم پر قبضہ کرلے، تو زکوٰۃ کے دیگر شرائط (نصاب، حولانِ حول) پوری ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ای پی ایف میں جمع شدہ رقم پر ملنے والے نفع کا حکم

سوال: (3)

ملازم اور کمپنی کی طرف سے ملائی ہوئی رقم پر ملنے والے نفع کا کیا حکم ہے؟ واضح رہے کہ ای پی ایف او میں جمع شدہ دونوں قسم کی رقم پر سرکار بڑی مقدار میں

اضافی رقم دیتی ہے اور اس کی شرح تبدیل کرتی رہتی ہے۔

جواب:(3)

ای پی ایف او (Employees Provident Fund Organization) میں ملازم اور کمپنی کی جانب سے جمع کی گئی رقم پر ملنے والے نفع کا حکم معلوم کرنے کے لیے درج ذیل امور کو سمجھنا ضروری ہے:

۱-رقم کا ماخذ: یہ رقم ملازم کی اپنی محنت کی کمائی اور کمپنی کی طرف سے اضافی ادائیگی پر مشتمل ہے۔

۲-نفع کا ذریعہ: حکومت کی جانب سے دیے جانے والے نفع کا تعلق سرمایہ کاری یا دیگر مالیاتی سرگرمیوں سے ہوتا ہے، جو عموماً سودی نظام پر مبنی ہوتی ہیں۔

۳-شرعی حکم: شریعت میں سودی نفع لینا اور دینا حرام ہے، جیسا کہ قرآن و سنت میں واضح دلائل موجود ہیں۔

فقہ حنفی کی مستند کتب سے حوالے:

۱-الدر المختار

عربی عبارت:"**وَكُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبًا، وَهُوَ مُحَرَّمٌ بِالنَّصِّ**" (الدر المختار مع رد المختار، جلد 5، صفحہ 163، دار الفکر بیروت)

ترجمہ: ہر وہ قرض جو نفع کو لازم کرے، وہ سود ہے اور نصِ قرآنی سے حرام ہے۔

۲-بدائع الصنائع:

عربی عبارت:"وَالْأَصْلُ فِی الرِّبَا أَنَّهُ الزِّیَادَةُ فِی الْقَرْضِ بِشَرْطٍ، وَهُوَ مُحَرَّمٌ لِقَوْلِهِ تَعَالَی: ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾" (بدائع الصنائع، جلد 6، صفحہ 69، دار الکتب العلمیہ بیروت)

ترجمہ: سود کا اصول یہ ہے کہ قرض پر مشروط اضافہ کیا جائے، اور یہ قرآن کی نص سے حرام ہے۔

۳-فتح القدیر:

عربی عبارت:"الرِّبَا مَا زَادَ عَلَی رَأْسِ الْمَالِ فِی الْقَرْضِ بِشَرْطٍ فِی الْعَقْدِ" (فتح القدیر، جلد 7، صفحہ 4، دار الفکر بیروت)

ترجمہ: سود وہ اضافہ ہے جو اصل مال پر قرض کے وقت شرط کے ساتھ کیا جائے۔

۴-شرح وقایہ:

عربی عبارت:"وَالْمَقْصُودُ بِالرِّبَا الزِّیَادَةُ الَّتِی تَكُونُ بِشَرْطٍ أَوْ بِغَیْرِ عِوَضٍ" (شرح الوقایہ، جلد 3، صفحہ 118، دار الفکر دمشق)

ترجمہ: سود سے مراد وہ اضافہ ہے جو شرط کے ساتھ یا بغیر عوض کے ہو۔

۵-ہدایہ

عربی عبارت:"وَالرِّبَا فِی الشَّرْعِ زِیَادَةٌ مَشْرُوطَةٌ فِی التَّعَامُلِ عَلَی وَجْهِ التَّوَاثُقِ" (ہدایہ، جلد 2، صفحہ 62، دار احیاء التراث العربی بیروت)

ترجمہ: شرع میں سود وہ مشروط اضافہ ہے جو لین دین کے معاملے میں

اتفاق کے طور پر ہو۔

حکم:

ای پی ایف او میں جمع شدہ رقم پر ملنے والا نفع سود کے زمرے میں آتا ہے، کیونکہ یہ سرمایہ کاری یا مالیاتی سرگرمیوں سے حاصل ہوتا ہے جو شرعی اصولوں کے مطابق نہیں۔لہذا:

۱-اصل رقم جو ملازم اور کمپنی کی جانب سے جمع کی گئی ہو، اسے استعمال کرنا جائز ہے۔

۲-اضافی نفع جو حکومت یا ادارہ دیتا ہے، وہ سود ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔اسے استعمال نہیں کرنا چاہیے بلکہ کسی نیک مقصد (مثلاً غریبوں کی فلاح) کے لیے بغیر نیتِ ثواب خرچ کر دینا چاہیے۔

ای پی ایف اور جی پی ایف میں جمع شدہ رقم کا حکم

سوال:(4)

جی پی ایف یعنی سرکاری ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ اور ای پی ایف یعنی غیر سرکاری ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ دونوں کا شرعی حکم یکساں ہے یا دونوں کے حکم میں فرق ہے؟

واضح رہے کہ سرکاری ملازمین کے لیے پراویڈنٹ فنڈ کا شرعی حکم مفتیان کرام کے درمیان مشہور ومعروف ہے اور جواہر الفقہ میں اس موضوع پر مستقل رسالہ ہے۔

لیکن بعض ماہرین سے معلوم ہوا ہے کہ سرکاری ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ کے سابقہ نظام میں کچھ تبدیلی آئی ہے، اس لیے ای پی ایف کے شرعی حکم پر بھی مزید غور وخوش کی ضرورت ہے۔

جواب:(4)

جی پی ایف (Government Provident Fund) اور ای پی ایف (Employee Provident Fund) کے شرعی احکام میں اصولی طور پر فرق ان کے نظام اور شرائط کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔شریعت اسلامی میں پراویڈنٹ فنڈ کا جائز یا ناجائز ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ آیا اس میں سود (ربا) شامل ہے یا نہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ دونوں نظاموں کا جائزہ لے کر شرعی اصولوں کے مطابق حکم بیان کیا جائے۔

ا-جی پی ایف (GPF) کا شرعی حکم:

سرکاری ملازمین کا پراویڈنٹ فنڈ ایک ایسا نظام ہے جس میں ملازمین کی تنخواہ کا ایک حصہ لازمی طور پر کاٹا جاتا ہے اور حکومت اس پر سود دیتی ہے۔چونکہ سود (ربا) قرآن وحدیث کے نصوص کی روشنی میں حرام ہے، اس لیے جی پی ایف کا سودی حصہ لینا جائز نہیں۔البتہ اصل رقم جو تنخواہ سے کٹی ہو، وہ حلال اور جائز ہے۔

فقہاء نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، جیسا کہ ''جواہر الفقہ'' میں اس موضوع پر مستقل رسالہ موجود ہے۔

۲-ای پی ایف (EPF) کا شرعی حکم:

ای پی ایف کا نظام نجی شعبے کے ملازمین کے لیے ہے، جس میں ملازمین اور آجر (Employer) دونوں اپنا حصہ جمع کراتے ہیں۔ اس رقم پر بھی اکثر سود دیا جاتا ہے۔ اگر ای پی ایف کے نظام میں سود شامل ہو تو اس کا حکم بھی جی پی ایف کی طرح ہوگا:

اصل رقم حلال ہے۔

سودی حصہ لینا حرام ہے۔

۳-تبدیلی کے بعد غور وخوض:

بعض ماہرین کے مطابق سرکاری ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ کے نظام میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ اگر یہ تبدیلیاں سود کے خاتمے اور اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں تو ان کا حکم تبدیل ہوسکتا ہے۔ ای پی ایف کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے جدید نظام کا جائزہ لیا جائے۔

فقہ حنفی کی کتب سے دلائل:

۱-فتاویٰ عالمگیری:

''وَكُلُّ قَرْضٍ جَرَّ نَفْعًا فَهُوَ رِبًا'' (فتاویٰ عالمگیری، کتاب البیوع، جلد 5، ص

397، مطبع: دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

ترجمہ: ہر وہ قرض جس میں نفع حاصل کیا جائے، وہ سود ہے۔

۲-الدر المختار:

"وَفِي الرِّبَا: مَا زَادَ عَلَى رَأْسِ الْمَالِ فَهُوَ حَرَامٌ" (الدر المختار، جلد 6، ص 458، مطبع: دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: اصل مال پر جو بھی اضافہ ہو، وہ حرام ہے۔

۳-البحر الرائق:

"الرِّبَا فِي الشَّرِيعَةِ هُوَ زِيَادَةُ مَالٍ فِي مُعَاوَضَةٍ بِلَا عِوَضٍ"

(البحر الرائق، جلد 7، ص 151، مطبع: دار الکتب العربی، قاہرہ)

ترجمہ: شریعت میں سود وہ ہے جو بغیر عوض کے مال میں اضافہ ہو۔

۴-بدائع الصنائع:

"الرِّبَا مُحَرَّمٌ بِالنَّصِّ فِي كُلِّ دَيْنٍ يَجُرُّ نَفْعًا" (بدائع الصنائع، جلد 5، ص 222، مطبع: دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

ترجمہ: ہر وہ قرض جو نفع دے، وہ نصِ شریعت کی رو سے حرام ہے۔

۵-فتاویٰ قاضی خان:

"الرِّبَا مُحَرَّمٌ شَرْعًا وَلَا يُجُوزُ التَّعَامُلُ بِهِ" (فتاویٰ قاضی خان، جلد 2، ص 98، مطبع: المکتب الاسلامی، دمشق)

ترجمہ: سود شرعاً حرام ہے اور اس کے ساتھ معاملہ کرنا جائز نہیں۔

نتیجہ:

جی پی ایف اور ای پی ایف دونوں کا شرعی حکم ان میں موجود سودی عنصر کی وجہ سے یکساں ہے۔ دونوں میں اصل رقم لینا جائز ہے، لیکن سودی رقم لینا قطعی حرام ہے۔ البتہ اگر ان نظاموں میں سود ختم کر دیا جائے اور کوئی اسلامی متبادل متعارف کرایا جائے تو ان کے جواز میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔

سرمایہ کاری کے بعض نئے طریقے

اسلامی بینکوں میں عقد مضاربت استمراری ہوتا ہے اس کا حکم کیا ہے؟

سوال:(1)

فقہاء کے یہاں عام طور پر عقد مضاربت میں مدت متعین ہوتی ہے، اس مدت کے پورا ہونے پر عقد مضاربت اپنی انتہاء کو پہنچ جاتا ہے، رب المال اور مضارب کو حسب معاہدہ نفع مل جاتا ہے؛ لیکن اسلامی بینکوں میں عقد مضاربت استمراری نوعیت کا ہوتا ہے، درمیان میں کوئی رب المال عقد سے باہر نکل جاتا ہے، اور نئے نئے ارباب مال داخل ہوتے رہتے ہیں، کیا یہ صورت درست ہے؟

جواب:(1)

عقدِ مضاربت اسلامی مالیاتی نظام میں ایک جائز اور مستند معاہدہ ہے، جس میں سرمایہ (رب المال) اور محنت (مضارب) کے درمیان ایک خاص طریقے سے نفع تقسیم کیا جاتا ہے۔ مضاربت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ معاہدہ شفاف ہو اور اس کے تمام شرائط قرآن وسنت اور فقہ کی رہنمائی کے مطابق ہوں۔

فقہاء کے نزدیک مضاربت کی مدت:

فقہ حنفی میں مضاربت کی مدت متعین کرنا ضروری نہیں ہے، لیکن اگر کوئی مدت مقرر کی جائے تو یہ معاہدے کے ختم ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ مدت کے اختتام پر معاہدہ ختم ہو جاتا ہے اور رب المال و مضارب کے درمیان نفع کی تقسیم ہو جاتی ہے۔

اسلامی بینکوں میں استمراری مضاربت:

اسلامی بینکوں میں جو "استمراری" (Continuing) مضاربت کا طریقہ رائج ہے، اس کی خاصیت یہ ہے کہ بعض سرمایہ کار معاہدے سے نکل سکتے ہیں اور نئے سرمایہ کار شامل ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں ہر سرمایہ کار کو اس کے نفع و نقصان کا حساب اس کی سرمایہ کاری کی مدت اور مقدار کے مطابق کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ جائز ہے، بشرطیکہ:

۱- ہر سرمایہ کار کے ساتھ علیحدہ معاہدہ موجود ہو۔

۲- معاہدے کی تمام شرائط شریعت کے مطابق ہوں۔

۳- نفع کی تقسیم کا طریقہ واضح اور شفاف ہو۔

دلائل:

قرآن مجید:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا" (البقرہ:275)

ترجمہ: اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا۔

یہ آیت تجارتی معاملات کو جائز قرار دیتی ہے، بشرطیکہ وہ سود سے پاک ہوں۔

حدیث شریف:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"المسلمون على شروطهم إلا شرطًا أحل حرامًا أو حرم حلالاً" (ترمذی، رقم: 1352)

ترجمہ: مسلمان اپنے معاہدوں پر قائم رہتے ہیں، سوائے اس شرط کے جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام کرے۔

فقہی عبارت:

فقہ کی کتاب "ہدایہ" میں مذکور ہے:

"وإذا انقضت مدة المضاربة أو فسخ أحدهما العقد فعلى العامل أن يرد المال مع الربح إن كان حصل" (الہدایہ، کتاب المضاربۃ)

ترجمہ: جب مضاربت کی مدت ختم ہو جائے یا معاہدہ فسخ کر دیا جائے تو عامل پر لازم ہے کہ اصل مال اور نفع (اگر حاصل ہوا ہو) واپس کر دے۔

استمراری مضاربت کا جواز:

فقہاء نے مضاربت میں شراکت کی اجازت دی ہے، جہاں مختلف سرمایہ

دار شامل ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ:

۱- نفع کی تقسیم واضح ہو۔

۲- ہر شریک کے لیے الگ حساب رکھا جائے۔

یہی اصول استمراری مضاربت پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

نتیجہ:

اسلامی بینکوں میں استمراری مضاربت کی یہ صورت، بشرطیکہ معاہدے کی شفافیت، نفع کی تقسیم، اور شرعی اصولوں کی پابندی ہو، جائز ہے۔

تنفیض تقدیری کی بنیاد پر نفع کی تقسیم کا حکم

سوال: (2)

جب مضاربت جاری رہتی ہے اور کوئی رب المال (سرمایہ کار) عقد سے باہر نکلتا ہے تو اس کے نفع ونقصان کا فیصلہ تقدیرا کیا جاتا ہے، یعنی کمپنی کے ٹھوس اور نقد اثاثہ کی قیمت لگائی جاتی ہے اور اس کے لحاظ سے اس کو نفع دیا جاتا ہے، جس کو اصطلاح میں تنفیض تقدیری کہتے ہیں، کیا اس طرح قیمت کا اندازہ کر کے ربح کی تقسیم درست ہوگی؟

جواب: (2)

مضاربت کے عقد میں جب رب المال عقد سے نکلنے کا ارادہ کرے تو اس

کے نفع ونقصان کا فیصلہ شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔فقہ حنفی میں اس سلسلے میں واضح اصول موجود ہیں۔اگر مضاربت کے دوران رب المال اپنے مال یا نفع کا حصہ نکالنا چاہے اور مضارب (تاجر) کے پاس مال تجارت موجود ہو، تو اس وقت ''تنفیض تقدیری'' یعنی مال کی قیمت لگانا اور اس کی بنیاد پر نفع ونقصان کی تقسیم شرعاً جائز ہے، بشرطیکہ قیمت لگانے کا عمل درست ہو اور تمام فریقین کی رضامندی شامل ہو۔

فقہاء نے یہ اصول ذکر کیا ہے کہ مضاربت میں شریک مال کی نقدی، ٹھوس اشیاء، اور دیگر اثاثہ جات کی قیمت لگا کر نفع ونقصان تقسیم کیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ مضاربت کا طبعی اور ضروری حصہ ہے۔

فقہ حنفی کے حوالے:

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''إذا أراد أحد الشريكين القسمة فإن كان مال المضاربة عينًا ولم يكن دينًا ولم يكن من جنس واحد ...فإنه يقتسمان بوزنه أو كيله أو قيمته'' (بدائع الصنائع، کتاب الشرکۃ، فصل فی القسمۃ، ج6، ص100)

یہ عبارت واضح کرتی ہے کہ مال تجارت کی تقسیم کے وقت قیمت کا اندازہ کرنا جائز ہے، بشرطیکہ تمام شرائط پوری ہوں۔

اسی طرح ''فتاویٰ عالمگیری'' میں بھی یہی اصول مذکور ہے:

''ولو كانت المضاربة قائمة والمال عرض، يُقوم في الحال

ویُقسم الربح بحسب التقویم" (فتاویٰ عالمگیری، کتاب الشرکۃ، ج3، ص226)

نتیجہ:

لہٰذا مضاربت کے دوران رب المال کے نکلنے کی صورت میں مال تجارت کی قیمت لگانا اور اس کے مطابق نفع ونقصان کی تقسیم کرنا شرعاً جائز اور فقہ حنفی کے اصول کے مطابق ہے، بشرطیکہ تمام شرکاء کی رضامندی حاصل ہو اور قیمت کا تعین دیانت داری سے کیا جائے۔

مضارب ایک ہو رب المال کئی ہوں اس صورت کا حکم

سوال: (3)

عام طور پر کتب فقہ میں مضاربت کی شکل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ایک رب المال ہے اور مضارب ہے، یہاں کمپنی مضارب ہوتی ہے اور اس کے مقابل کئی رب المال ہوتے ہیں، کیا یہ بات درست ہے؟

جواب: (3)

مضاربت ایک ایسا شرعی عقد ہے جس میں ایک فریق سرمایہ فراہم کرتا ہے (رب المال) اور دوسرا فریق اپنی محنت و مہارت کے ذریعے کاروبار کرتا ہے

(مضارب)۔ حاصل ہونے والے نفع کو پہلے سے طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے۔

فقہ حنفی کی کتابوں میں مضاربت کی بنیادی تعریف یہ دی گئی ہے:

"المضاربة أن يدفع الرجل إلى الرجل مالاً يتجر فيه على أن ما رزق الله من ربح فهو بينهما على ما شرطا" (ہدایہ، کتاب المضاربہ)

یعنی ایک شخص (رب المال) دوسرے کو مال دے تاکہ وہ اس میں تجارت کرے، اور جو نفع ہو، وہ طے شدہ شرط کے مطابق دونوں میں تقسیم ہو۔

کمپنی مضارب اور متعدد افراد رب المال:

اسلامی تعلیمات کے مطابق مضاربت میں اصل طور پر ایک رب المال اور ایک مضارب ہوتا ہے۔ تاہم، اگر متعدد افراد ایک مضارب کو سرمایہ فراہم کریں، یا ایک سرمایہ کار کئی مضاربین کو مال دے، تو یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ ہر فریق کے درمیان معاہدہ شفاف ہو اور نفع کی تقسیم کا طریقہ پہلے سے طے ہو۔

فقہ حنفی کی کتب میں یہ وضاحت موجود ہے کہ اگر رب المال یا مضارب متعدد ہوں، تو یہ عقد درست ہے، مثلاً:

"وإذا اشترك رجلان ودفعا مالًا إلى رجل يتجر فيه والربح بين الثلاثة جاز" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 4، ص 292)

یعنی دو افراد نے مضاربت کے لیے مال دیا اور نفع تینوں میں تقسیم ہو، تو یہ جائز ہے۔

عصر حاضر کی کمپنیوں کی مضاربت:

آج کل کی کمپنیاں مضارب کی حیثیت رکھتی ہیں، اور عوام (سرمایہ کار) رب المال کے طور پر سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔ یہ صورت جائز ہے، بشرطیکہ:

۱- کمپنی سرمایہ کاروں سے معاہدے میں شفاف ہو۔

۲-نفع ونقصان کی تقسیم کا طریقہ پہلے سے متعین ہو۔

۳-نقصان کی صورت میں سرمایہ کار اپنا نقصان برداشت کریں اور کمپنی کی انتظامیہ (مضارب) اپنی محنت کا نقصان برداشت کرے۔

خلاصہ:

لہٰذا، کمپنی کو مضارب ماننا اور عوام کو متعدد رب المال کے طور پر تسلیم کرنا شرعاً درست ہے، بشرطیکہ مذکورہ شرائط کی پابندی کی جائے۔

شرکت کی ایک صورت اور اس کا حکم

سوال: (4)

اسلامی بینکوں میں شرکت کی ایک شکل وہ ہے جس کو شرکت متناقصہ کہا جاتا

ہے، جس میں دوشریکوں میں سے ایک کی ملکیت کا تناسب بڑھتا جاتا ہے، اور دوسرے کا گھٹتا جاتا ہے، جیسے ایک شخص نے اس طرح مکان فروخت کیا کہ خریدار نے ۲۰ فیصد رقم نقد ادا کردی اور ۸۰ فیصد ادھار رکھی، اس طرح اول دن ہی خریدار فیصد کا مالک ہوگیا، اب اگر وہ اس مکان کو کرایہ پر لے لے تو اس کو ۸۰ فیصد ہی کرایہ ادا کرنا ہوگا؛ کیونکہ ۲۰ فیصد اس کی اپنی ملکیت ہے، تین ماہ کے بعد اس نے مزید بیس فیصد کی قیمت ادا کردی، اسی طرح مثلاً تین تین ماہ پر قیمت ادا کرتا رہا، یہاں تک کہ پورے مکان کا مالک ہوگیا، بائع کا فائدہ یہ ہے کہ اس کا سامان آسانی سے فروخت ہوگیا اور جب تک پوری قیمت ادا نہیں ہوئی، بقیہ حصوں کا کرایہ ملتا رہا، اور خریدار کا یہ فائدہ ہوا کہ آہستہ آہستہ وہ مکان کا مالک ہوگیا اور کرایہ ادا کرنے سے نجات مل گئی، کیا شرکت کی یہ صورت درست ہوگی؟

جواب:(4)

شرکت متناقصہ کی مذکورہ صورت، جس میں ایک شریک کا حصہ تدریجاً کم ہوتا ہے اور دوسرے کا بڑھتا ہے، اگر شرعی اصولوں کے مطابق ہو تو اس کی گنجائش ہے۔ فقہ حنفی اور اسلامی مالیاتی اصولوں کی روشنی میں اس کے جواز کے لئے درج ذیل شرائط کی رعایت ضروری ہے:

۱- بیع اور اجارہ کی تفریق: خریدار اور بائع کے درمیان بیع (ملکیت کی منتقلی) اور اجارہ (کرایہ) کے معاملات کو الگ الگ رکھا جائے، تاکہ کسی قسم کی شرطی بیع یا سود

کا شائبہ نہ ہو۔

۲-کرایہ ملکیت کے تناسب سے ہو: جس قدر خریدار مکان کا مالک بن چکا ہے، اس کے مطابق کرایہ کم ہوتا جائے۔ مثلاً، اگر خریدار پہلے دن 20 فیصد مالک بن گیا، تو صرف 80 فیصد حصہ کا کرایہ ادا کرے گا۔ جیسے جیسے وہ مزید رقم ادا کرے گا، کرایہ کم ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ مکمل ملکیت حاصل کرلے۔

۳-کرایہ اور قیمت کی وضاحت: کرایہ اور خریداری کی اقساط کی مقدار واضح اور معاہدے میں تحریری طور پر طے کی گئی ہو۔

۴-سود سے اجتناب: اس معاہدے میں سود (ربا) کا عنصر شامل نہ ہو، یعنی اضافی رقم صرف حقیقی کرایہ یا قسط کی صورت میں ہو، نہ کہ قرض پر نفع کی شکل میں۔

فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں اس قسم کے معاملات کو درست قرار دینے کے اصول موجود ہیں، بشرطیکہ ان میں شرطی بیع، سود، یا دھوکہ دہی کا شائبہ نہ ہو۔ الدر المختار میں ہے:

"وإذا وقعت المعاملة على وجه شرعي خلت عن الربا والغش جازت" (الدر المختار علی رد المحتار: کتاب البیوع)

اسی طرح المبسوط میں مشارکت اور اجارہ کے جائز ہونے کی وضاحت موجود ہے، بشرطیکہ ہر فریق کے حقوق واضح ہوں اور کسی پر ظلم نہ ہو:

"كل عقد يجوز فيه النفع للمتعاقدين مع خلوه من

المحظورات الشرعية فهو جائز" (المبسوط: کتاب الشرکۃ)

خلاصہ:

یہ کہ شرکت متناقصہ کی یہ صورت شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ درست ہے، بشرطیکہ تمام شرائط مکمل ہوں اور فریقین کے حقوق وفرائض واضح طور پر متعین ہوں۔

کمپنی کو شخصیت اعتباری کا درجہ دینے کا حکم

سوال:(5)

بہت سی دفعہ کسی بڑے پروجیکٹ کے لئے مضاربت یا شرکت وجود میں آتی ہے، جس میں کمپنی کی حیثیت مضارب یا شریک کی ہوتی ہے، اور دوسری طرف بہت سے افراد ہوتے ہیں، یا کمپنی ہوتی ہے، عام طور پر فقہاء کے ہاں دو شخصیتوں کے درمیان مضاربت اور شرکت کا تصور ہے؛ لیکن اس صورت میں کمپنی کو شخصیت کا درجہ دیا جاتا ہے، قانون کی اصطلاح میں ایسی صورت میں کمپنی کو شخصیت قانونی یا شخصیت اعتباری کہا جاتا ہے، کیا اسلام میں بھی شخصیت اعتباری کا تصور قابل قبول ہے، جس کا صرف قانونی وجود ہو، اور اس کو ایجاب وقبول کا اہل مانا جائے؟

جواب:(5)

اسلامی شریعت میں شخصیت اعتباری کا تصور بنیادی طور پر قبول کیا گیا ہے،

بشرطیکہ اس کا وجود ایسے امور کے لئے ہو جو شرعاً جائز ہوں اور اس کا استعمال ایسے مقاصد کے لئے نہ کیا جائے جو شریعت کے خلاف ہوں۔فقہ حنفی میں اس تصور کی بنیاد اجتماعیت اور تعاملات کے اصولوں پر ہے۔

شخصیت اعتباری کی وضاحت:

شخصیت اعتباری کا مطلب یہ ہے کہ کسی ادارے، کمپنی یا جماعت کو ایک ایسی حیثیت دی جائے جس میں وہ فرد کے طور پر تصرفات کا اہل ہو، جیسے ایجاب وقبول کرنا، معاہدے کرنا، یا ملکیت رکھنا۔ یہ تصور شریعت میں ''اہلیت'' اور ''وکالت'' کے اصولوں پر مبنی ہے۔

فقہاء کے نزدیک، اگر کسی جماعت یا تنظیم کو اجتماعی طور پر معاملات سرانجام دینے کے لئے تشکیل دیا جائے، اور اس کا وجود حقیقی نہ ہو بلکہ قانونی اور اعتباری ہو، تو یہ جائز ہے، بشرطیکہ اس کا استعمال شریعت کے دائرے میں ہو۔امام سرخسیؒ نے فرمایا:

"وكل جماعة اجتمعوا على أمر مباح يصح تصرفهم فيه ويتحمل كل واحد منهم ما يلزمه من الحقوق المشتركة" (المبسوط، 22/39)

مضاربت وشرکت میں شخصیت اعتباری کا اطلاق:

مضاربت اور شرکت میں، اگر کسی کمپنی کو شریک یا مضارب مانا جائے، تو فقہاء کے ہاں یہ اصول موجود ہے کہ کمپنی کے ذمہ داران (agents) اس کی جانب

سے تصرف کرسکتے ہیں۔ فقہ حنفی میں ''وکالت'' کے اصول کے تحت یہ جائز ہے کہ کوئی جماعت یا کمپنی اپنے نمائندے کے ذریعے معاملات کرے، اور اس کے تمام افراد یا مالکان اس کے فوائد ونقصانات میں شریک ہوں۔

دلائل:

۱-قرآن کریم:

''**وتعاونوا على البر والتقوىٰ**'' (سورۃ المائدہ:2)

اس آیت میں اجتماعیت اور تعاون کی ترغیب دی گئی ہے، جو شخصیت اعتباری کے تصور کو جواز فراہم کرتی ہے، بشرطیکہ یہ تعاون نیک کاموں میں ہو۔

۲-حدیث مبارکہ:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

''**المسلمون على شروطهم**'' (سنن ابی داود، حدیث:3594)

اس حدیث کی روشنی میں، اگر کوئی تنظیم یا کمپنی شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے معاہدہ کرتی ہے، تو اس کا اعتبار کیا جائے گا

۳-فقہاء کی تصریحات:

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

''**ويجوز تصرف الوكيل عن الجماعة فيما يتعلق بالمصالح**

المشترکة" (ردالمختار، 4/553)

نتیجہ:

اسلامی شریعت میں شخصیت اعتباری کا تصور، جیسا کہ کمپنی کو ایک قانونی وجود ماننا، جائز ہے، بشرطیکہ وہ شریعت کے اصولوں کے مطابق ہو اور اس کا استعمال جائز مقاصد کے لئے کیا جائے۔ مضاربت و شرکت میں ایسی کمپنی کو شریک یا مضارب تسلیم کرنا شرعی اصولوں کے مطابق درست ہے۔

خریدار کا بینک کی طرف سے خریدنا اور اپنے نام رسید بنانا کیا قبضہ تصور ہوگا؟

سوال: (6)

اسلامی بینکوں میں مرابحہ کی صورت بھی اختیار کی جاتی ہے، مرابحہ میں ایک مسئلہ تو قبضہ کا ہے؛ لیکن اس وقت یہ زیر بحث نہیں ہے؛ البتہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس میں ایک شخص کسی خاص دکان یا کمپنی سے ایک سامان خریدنا چاہتا ہے، وہ اسلامی بینک سے درخواست کرتا ہے کہ بینک یہ سامان خرید کر ادھار قیمت پر مجھے دیدے، اگر وہ مرابحۃً فروخت کرے تو میں اس کو بھی قبول کروں گا، کمپنی اس شخص کو وکیل بنا دیتی

ہے کہ وہ مذکورہ سامان اس دکان سے خرید کر لے اور اپنے قبضہ میں لے لے، بیچنے والا خود یا اس کا کوئی اور نمائندہ اس سامان کی خریداری کے لئے نہیں جاتا؛ تو کیا خود اس خریدار کا بینک کی طرف سے خرید کر لینا، اپنے نام سے اس کی رسید بنانا اور اس کو اپنے تصرف میں لینا قبضہ سمجھا جائے گا، یا یہ بیع قبل القبض کے دائرہ میں آ جائے گا؟

جواب:(6)

مرابحہ اسلامی مالیاتی معاملات میں ایک اہم اور کثرت سے استعمال ہونے والی صورت ہے، لیکن اس کے صحیح اور شرعی ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں شرعی اصولوں کی مکمل پابندی کی جائے۔ آپ کے سوال میں جو صورت ذکر کی گئی ہے، اس میں اہم مسئلہ ''قبضہ'' کا ہے۔

قبضہ کی شرعی حیثیت:

فقہ حنفی میں یہ اصول موجود ہے کہ کسی بھی چیز کو بیچنے سے پہلے اس پر مکمل قبضہ ضروری ہے۔ اس کی بنیاد نبی اکرم ﷺ کی حدیث ہے:

''مَنْ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتَّى يَسْتَوْفِيَهُ'' (صحیح البخاری، حدیث نمبر: 2136)

یعنی: ''جو شخص کوئی چیز خریدے تو اس پر قبضہ کیے بغیر اسے نہ بیچے''۔

سوال میں ذکر کردہ صورت:

آپ کے سوال کے مطابق اگر خریدار ہی بینک کا وکیل بن کر سامان خریدتا

ہے اور اپنی رسید اپنے نام سے بناتا ہے، تو یہ معاملہ شریعت کی نظر میں چند پہلوؤں سے قابل غور ہے:

۱- وکیل کی حیثیت:

جب بینک خریدار کو وکیل بناتا ہے، تو وہ شرعاً بینک کے لیے بطور وکیل کام کررہا ہوتا ہے۔ لہٰذا جب وہ سامان خرید کر اپنے قبضہ میں لیتا ہے، تو یہ قبضہ بینک کے لئے ہوگا، نہ کہ اس کی اپنی طرف سے۔

۲- بیع قبل القبض کا شبہ:

اگر وکیل یعنی خریدار بینک کی جانب سے سامان خرید کر فوراً اپنے ہی ساتھ مرابحہ کی بنیاد پر معاہدہ کر لیتا ہے، تو اس میں ''بیع قبل القبض'' کا شبہ پیدا ہوسکتا ہے، کیونکہ وہ سامان حقیقت میں ابھی تک بینک کے عملی تصرف میں نہیں آیا۔

۳- شرعی موقف:

مرابحہ کے صحیح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ:

بینک سامان خرید کر اس پر حقیقی یا حکمی قبضہ کرے۔

اس کے بعد وہ خریدار کے ساتھ مرابحہ کا معاہدہ کرے۔

خریدار کے نام سے رسید بنانا اور قبضہ کرنا تبھی جائز ہوگا جب وہ بطور وکیل

بینک کے لئے کرر ہا ہو، اور معاہدہ کرنے سے پہلے قبضہ بینک کا ثابت ہو۔

فقہ حنفی کی مستند عبارات:

فقہ حنفی کی مشہور کتاب الدر المختار میں ہے:

"لَا یَصِحُّ الْبَیْعُ قَبْلَ الْقَبْضِ فِی الْمَکِیلِ وَالْمَوْزُونِ وَالْمَعْدُودِ"

(الدر المختار، کتاب البیوع)

یعنی: "ناپنے، تولنے اور گننے والی چیزوں میں قبضہ سے پہلے بیع درست نہیں"۔

اسی طرح فتح القدیر میں قبضہ کے مفہوم کو واضح کیا گیا ہے:

"اَلْقَبْضُ شَرْطٌ لِصِحَّةِ التَّصَرُّفِ فِی الْمَبِیعِ" (فتح القدیر، جلد 5، صفحہ 280)

خلاصہ:

اس صورت میں اگر خریدار بطور وکیل سامان خریدتا ہے اور اپنے قبضے میں لیتا ہے، تو یہ قبضہ حکماً بینک کے لئے شمار ہوگا۔ تاہم، سامان کی خریداری کے بعد بینک کو ضروری ہے کہ وہ اس پر اپنی ملکیت ثابت کرے، جیسے رسید اپنے نام پر بنانا، اور اس کے بعد مرابحہ کی بنیاد پر خریدار کے ساتھ معاہدہ کرے۔

اگر یہ ترتیب نہ ہو، تو یہ بیع قبل القبض کے زمرے میں آ سکتی ہے، جو کہ فقہ حنفی اور شریعت کے مطابق درست نہیں۔

شیئر مارکیٹ کے بعض اہم جزئیات کے احکامات

سوال:(7)

آج کل سرمایہ کاری کی ایک اہم صورت شیئر مارکیٹ ہے؛ لیکن شیئر مارکٹ میں زیادہ تر خلاف شرع طریقہ پر شیئر کی خرید وفروخت کی جاتی ہے؛ چوں کہ یہ نظام اپنے ہاتھ میں نہیں ہے اور اکثر کمپنیاں حرام کاروبار میں بھی ملوث ہوتی ہیں؛ اس لئے موجودہ دور میں اسلامی معاشیات کے ماہرین نے آسانی کے لئے یہ تصور دیا ہے کہ جن کمپنیوں کا بنیادی کاروبار ہی حرام ہو، جیسے: وہ حرام غذائی مصنوعات تیار کرتی ہوں، شراب تیار کرتی یا بیچتی ہوں، سود وقمار کا معاملہ کرتی ہوں تو ان کا خریدنا تو قطعاً جائز نہیں ہے، لیکن اگر اصل کاروبار حلال ہو؛ مگر جزوی طور پر کمپنی حرام کاروبار میں بھی ملوث ہو اور ایسے کاروبار میں لگنے والا سرمایہ ایک تہائی یا اس سے کم ہو اور اس سے حاصل ہونے والا نفع مجموعی نفع میں زیادہ سے زیادہ پانچ فیصد ہو تو اس کو گوارا کیا جا سکتا ہے، ایسے شیئر کا خرید کرنا جائز ہوگا؛ البتہ ناجائز سرمایہ کاری سے جو نفع حاصل ہوا ہو، یا بینک کو سرکاری بینک میں محفوظ کئے ہوئے سرمایہ پر سود حاصل ہوا ہو تو اس کو صدقہ کر دینا واجب ہوگا، کیا یہ بات درست ہوگی؟

آپ سے درخواست ہے کہ کتاب وسنت، فقہاء کے اجتہادات، شریعت کے اصول ومقاصد اور موجودہ دور کی مصالح وضروریات کو سامنے رکھ کر تحقیق وتفصیل

کے ساتھ ان کے جوابات دیں۔

جواب:(7)

شیئر مارکیٹ میں سرمایہ کاری کے تعلق سے جو سوال پیش کیا گیا، اس کا جواب قرآن وسنت اور فقہ حنفی کی روشنی میں درج ذیل تفصیل کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے:

شیئر مارکیٹ کے اصولی احکام:

۱-شیئرز کی خرید وفروخت کا جواز:

شیئرز کی خرید وفروخت اصولی طور پر جائز ہے بشرطیکہ:

کمپنی کا اصل کاروبار جائز اور حلال ہو۔

لین دین میں کسی خلافِ شرع معاہدہ (جیسے سود، قمار یا دھوکہ دہی) کا ارتکاب نہ ہو۔

شیئرز کی قیمت حقیقی اثاثوں (assets) پر مبنی ہو، نہ کہ محض قیاس آرائی یا دھوکہ پر۔

۲-حرام کاروبار میں ملوث کمپنیاں:

اگر کسی کمپنی کا بنیادی کاروبار ہی حرام ہو، جیسے شراب کی تجارت، سودی لین دین، یا غیر شرعی سرگرمیاں، تو اس میں سرمایہ کاری کرنا اور اس کے شیئرز خریدنا شرعاً

قطعی طور پر نا جائز ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

”وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“

(سورۃ المائدہ:2)

ترجمہ: ”نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ و زیادتی میں مدد نہ کرو“۔

۳- جزوی طور پر حرام معاملات میں ملوث کمپنیاں:

فقہاء نے موجودہ دور کی پیچیدگیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے معاملات میں چند شرائط کے ساتھ نرمی دی ہے:

کمپنی کا بنیادی کاروبار حلال ہو۔

کمپنی کے مجموعی سرمائے میں حرام آمدنی کا حصہ ایک تہائی (33%) سے کم ہو۔

حرام ذرائع سے حاصل شدہ نفع مجموعی نفع کے 5% سے زیادہ نہ ہو۔

حرام نفع کو الگ کر کے صدقہ کر دینا واجب ہو۔

فقہی حوالہ:

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

”کل ما کان الغالب فیه الحلال یکون العقد حلالاً، وما کان

الغالب فيه الحرام يكون العقد حراماً" (ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب البیوع)

ترجمہ: "ہر وہ معاملہ جس میں غالب حصہ حلال کا ہو، اس کا عقد جائز ہے، اور جس میں غالب حصہ حرام کا ہو، وہ عقد نا جائز ہے"۔

حرام آمدنی کو صدقہ کرنا:

ایسی کمپنیوں سے حاصل شدہ نفع، جو حرام ذرائع سے آیا ہو، اسے صدقہ کرنا واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

"**إن الله طيب لا يقبل إلا طيباً**" (صحیح مسلم:1015)

ترجمہ: "اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاکیزہ مال کو قبول کرتا ہے"۔

موجودہ دور کی مصالح وضروریات:

چونکہ موجودہ دور میں مکمل طور پر حلال سرمایہ کاری کے مواقع محدود ہیں، اس لیے علماء نے چند سخت شرائط کے ساتھ جزوی طور پر ایسی کمپنیوں میں سرمایہ کاری کو جائز قرار دیا ہے، جن کا بنیادی کاروبار حلال ہو اور حرام کا عنصر انتہائی محدود ہو۔

نتیجہ:

لہٰذا، شرعی اصولوں کی روشنی میں:

ا- حرام کاروبار میں ملوث کمپنیوں کے شیئرز خریدنا قطعاً نا جائز ہے۔

۲- حلال کاروبار کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز خریدنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ مذکورہ شرائط پر عمل کیا جائے۔

۳-حرام ذرائع سے حاصل شدہ نفع کو صدقہ کرنا ضروری ہے، اور اسے اپنی ملکیت میں رکھنا حرام ہے۔

شرکت محدودہ (لمیٹیڈ کمپنی) اور شخص قانون سے متعلق مسائل کی تنقیح

لمٹیڈ کمپنی کی شرعی حیثیت

سوال:(1)

لمیٹڈ کمپنی کا جو تصور ہے، کیا یہ شریعت کے مطابق ہے؟ فقہی نظائر و اصول کی روشنی میں یہ جواز کے دائرے میں آتا ہے یا نہیں؟

جواب:(1)

لمیٹیڈ کمپنی کا تصور اور اس کی شرعی حیثیت:

لمیٹیڈ کمپنی (Limited Company) ایک ایسا ادارہ ہے جو قانونی طور پر ایک الگ شخصیت (Separate Legal Entity) رکھتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے شیئر ہولڈرز (حصہ داران) کی ذمہ داری محدود ہوتی ہے، یعنی کمپنی کے قرض یا نقصانات کا بوجھ شیئر ہولڈرز کی ذاتی جائیداد پر نہیں ڈالا جاتا، بلکہ صرف ان کی سرمایہ کاری (Investment) تک محدود رہتا ہے۔

شریعت کی روشنی میں:

فقہ اسلامی کے اصولوں کے مطابق، شرکت اور مضاربت جیسے کاروباری معاملات کی بنیاد امانت، دیانت، اور ذمہ داری پر رکھی گئی ہے۔ جب لمیٹیڈ کمپنی کے تصور کو اسلامی تعلیمات کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے تو درج ذیل امور قابل غور ہیں:

۱-شخص قانونی (Legal Personality) کا تصور:

شریعت میں کسی کمپنی یا ادارے کو شخص کے درجے میں ماننے کا کوئی براہ راست نص موجود نہیں، کیونکہ یہ جدید قانونی تصور ہے۔ تاہم فقہاء نے وقف، بیت المال، اور دیگر اجتماعی اداروں کو ایک الگ شخصیت کے طور پر تسلیم کیا ہے، جس سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شریعت میں اصولی طور پر ایسے اجتماعی اداروں کو وجود میں لانا جائز ہے جن کے ذمے اجتماعی امور ہوں۔

۲-محدود ذمہ داری(Limited Liability):

فقہاء کے درمیان محدود ذمہ داری کا مسئلہ جدید ہے، اور اس پر فقہی تحقیقات موجود ہیں۔

اگر محدود ذمہ داری کو شرکت کے اصولوں کے تحت رکھا جائے، تو اس کی اجازت ہوسکتی ہے، بشرطیکہ یہ شرط تمام شرکاء کی رضامندی سے ہو۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ عقود میں شروط کی گنجائش موجود ہے، جب تک کہ وہ شرط

شریعت کے کسی اصول سے متصادم نہ ہو۔

جیسا کہ امام ابن قدامہ لکھتے ہیں:

"کل شرط یقتضیه العقد أو یوافق مقتضاه فهو صحیح" (المغنی، جلد 6، صفحہ 39، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

۳- کمپنی کے قوانین اور اصول:

شریعت کی نظر میں کمپنی کے قوانین کو جانچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ:

کمپنی کا اصل کاروبار حلال ہو۔

غیر شرعی طریقوں سے نفع کمانا یا سودی معاملات سے اجتناب کیا جائے۔

شیئر ہولڈرز کے درمیان حقوق وفرائض کی تقسیم شریعت کے مطابق ہو۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں کے حوالے:

۱- المبسوط:

امام سرخسی لکھتے ہیں:

"إذا تراضیا الشریکان علی شیء یمکن إثباته فی الشرع فهو جائز" (المبسوط، جلد 11، صفحہ 179، مطبع دار المعرفۃ، بیروت)

۲- الدر المختار:

علامہ حصکفی فرماتے ہیں:

"وکل عقد جائز بالشروط الصحیحة مالم یکن فیه غرر أو

ضرر" (الدرالمختار، جلد 4، صفحہ 515، مطبع دارالفکر، بیروت)

۳-بدائع الصنائع:

امام کاسانی لکھتے ہیں:

"كل شرط لا يخالف مقتضى العقد جائز في الشرع" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 56، مطبع دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

نتیجہ:

اگر لمیٹیڈ کمپنی کا نظام حلال کاروبار پر مبنی ہو، سود اور حرام معاملات سے پاک ہو، اور اس کی شرائط شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہوں، تو ایسی کمپنی کا قیام اور اس میں شراکت جائز ہے۔ محدود ذمہ داری کا تصور، شرکاء کی رضامندی اور واضح شرائط کے ساتھ، شریعت کے دائرے میں رہ کر قبول کیا جا سکتا ہے۔

کمپنی میں شرکت کا حکم

سوال:(2)

اگر کوئی کمپنی مذکورہ بالا اصول پر قائم کی جائے تو شراکت جائز ہوگی یا فاسد؟

جواب:(2)

ایسی کمپنی میں شراکت کی شرعی حیثیت:

اگر کوئی کمپنی مذکورہ بالا اصولوں پر قائم کی گئی ہو، یعنی:

۱- کمپنی کا کاروبار مکمل طور پر حلال ہو۔

۲- سود، دھوکہ، غرر، اور دیگر غیر شرعی امور سے پاک ہو۔

۳- شیئر ہولڈرز اور شریک کاروں کے درمیان حقوق و فرائض واضح ہوں۔

۴- محدود ذمہ داری کا اصول تمام شرکاء کی رضامندی سے طے کیا گیا ہو۔

تو ایسی کمپنی میں شراکت کرنا شریعت کے اصولوں کے مطابق جائز ہوگا، بشرطیکہ تمام شرائط شرعی اصولوں کے مطابق ہوں۔

شرعی دلائل:

۱- شرطِ رضامندی کی بنیاد:

فقہ حنفی میں یہ اصول مسلم ہے کہ اگر شرکاء باہمی رضامندی کے ساتھ ایسے اصول وضع کریں جو شرعاً ممنوع نہ ہوں، تو وہ قابل قبول ہیں۔ جیسا کہ امام سرخسی فرماتے ہیں:

"کل شرط یقتضیه العقد أو یوافق مقتضاه فهو صحیح، وما لا فلا" (المبسوط، جلد 11، صفحہ 179، مطبع دار المعرفۃ، بیروت)

یعنی: ہر وہ شرط جو عقد کے تقاضے سے ہم آہنگ ہو یا اس کے تقاضے کے موافق ہو، وہ جائز ہے۔

۲- شراکت میں حلال تجارت کی شرط:

فقہاء نے شراکت کے جواز کی شرط یہ رکھی ہے کہ کاروبار حلال ہو اور اس

میں سود یا حرام اشیاء شامل نہ ہوں۔جیسا کہ علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں:

"**وشرطها أن يكون العمل مباحاً، والنفع مباحاً**" (ردالمحتار، جلد 6، صفحہ 402، مطبع دارالفکر، بیروت)

یعنی: شراکت کی شرط یہ ہے کہ اس میں عمل اور نفع دونوں مباح ہوں۔

۳-شرکت میں شرط کا جواز:

علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

"**وكل شرط يصح في الشركة ما لم يكن مفسداً للعقد أو مخالفاً للشرع**" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 117، مطبع دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

یعنی: شراکت میں ہر شرط جائز ہے، جب تک وہ عقد کو فاسد نہ کرے یا شریعت کے خلاف نہ ہو۔

۴-محدود ذمہ داری کی شرط:

فقہاء کے نزدیک یہ اصول تسلیم شدہ ہے کہ عقد کے فریقین اگر ذمہ داری محدود کرنے پر متفق ہوں اور یہ شرط کسی شرعی حکم کے خلاف نہ ہو، تو جائز ہے۔

فقہ حنفی کے نظائر:

۱-عقدِ شرکت: فقہ حنفی میں شرکت کے جواز کے اصول موجود ہیں، بشرطیکہ تمام شرائط واضح اور متفق علیہ ہوں۔

۲-نئی ضروریات کا ادراک: جدید فقہاء نے اجتماعی اداروں اور کمپنیوں کے قیام

کوشریعت کے دائرے میں رکھتے ہوئے جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ ان کا عمل حلال ہو۔

نتیجہ:

اگر مذکورہ بالا اصولوں پر کمپنی قائم کی گئی ہو، تو ایسی کمپنی میں شراکت کرنا جائز ہوگا اور اس کے تمام معاملات شرعی اصولوں کے مطابق ہوں گے، بشرطیکہ:

۱-کاروبار حلال ہو۔

۲-شراکت کے تمام شرکاء کی رضامندی شامل ہو۔

۳-شرائط شریعت کے اصولوں سے متصادم نہ ہوں۔

لہٰذا، ایسی کمپنی میں شراکت جائز ہے اور یہ فاسد کے دائرے میں نہیں آتی۔

کمپنی کے مالکان کے نفع کا حکم

سوال:(3)

حاملانِ حصص (کمپنی کے مالکان) جو نفع کمائیں گے یہ ان کے لیے جائز رہے گا یا ناجائز؟

جواب:(3)

کمپنی کے حاملانِ حصص (شیئر ہولڈرز) کا نفع اور اس کی شرعی حیثیت:

کمپنی کے حاملانِ حصص (شیئر ہولڈرز) کو ان کے شیئرز کے تناسب سے جو

نفع ملتا ہے، وہ شرعی طور پر جائز ہوگا یا نہیں، اس کا فیصلہ درج ذیل اصولوں کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے:

۱- کمپنی کے کاروبار کی نوعیت:

اگر کمپنی کا کاروبار شریعت کے مطابق حلال ہے اور سود، دھوکہ، یا حرام اشیاء کی تجارت پر مبنی نہیں ہے، تو اس کا حاصل شدہ نفع بھی جائز ہوگا۔ فقہاء نے اس بات پر زور دیا ہے کہ نفع کی شرعی حیثیت کا دار و مدار اس کی اصل نوعیت پر ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں:

"المعاملات مبناها على التراضي فيما لا يحرم شرعاً" (ردالمحتار، جلد 5، صفحہ 4، مطبع دارالفکر، بیروت)

یعنی: معاملات کی بنیاد رضامندی پر ہے، جب تک وہ شریعت میں حرام نہ ہوں۔

۲-شرکت اور سرمایہ کاری کے اصول:

فقہ حنفی میں سرمایہ کاری اور شراکت کے اصول بیان کیے گئے ہیں، جن کے مطابق نفع کا حصول جائز ہے، بشرطیکہ سرمایہ کاری کسی جائز کام میں کی گئی ہو۔ امام کاسانی فرماتے ہیں:

"كل مال يحل الانتفاع به يحل كسبه بكل طريق مشروع"

(بدائع الصنائع، جلد 6، صفحہ 66، مطبع دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

یعنی: ہر وہ مال جس سے شریعت کے مطابق نفع حاصل کرنا جائز ہو، اس کا

کسب بھی جائز ہے۔

۳-نفع کی تقسیم:

کمپنی کے شیئر ہولڈرز کو جو نفع ملتا ہے، وہ کمپنی کے مجموعی منافع سے ان کے حصے کے تناسب کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔ یہ شراکت کے اصول کے مطابق ہے، جیسا کہ امام سرخسی لکھتے ہیں:

"إذا كان الربح وفق حصص الشركاء، فلا بأس بذلک"

(المبسوط، جلد 11، صفحہ 182، مطبع دارالمعرفۃ، بیروت)

یعنی: اگر نفع شرکاء کے حصص کے مطابق تقسیم ہو رہا ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

فقہ حنفی کے نظائر:

۱-شرکتِ عنان: فقہاء نے شرکت عنان میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ نفع اسی صورت جائز ہے جب شراکت کے اصولوں کے مطابق ہو۔

۲-مضاربت کے اصول: مضاربت کے اصول میں بھی سرمایہ کار کو نفع دینا جائز ہے، بشرطیکہ کام اور سرمایہ دونوں حلال ہوں۔

نفع کے جواز کی شرائط:

۱- کمپنی کا اصل کاروبار حلال ہو۔

۲- کمپنی کے تمام معاملات سود، غرر، اور دھوکہ سے پاک ہوں۔

۳-نفع کی تقسیم شرعی اصولوں کے مطابق ہو۔

اگر کمپنی سودی یا حرام کاروبار میں ملوث ہو۔

اگر کمپنی کا کاروبار حرام ذرائع پر مبنی ہو، جیسے سود، قمار (جوا)، یا حرام اشیاء کی تجارت، تو اس صورت میں حاملانِ حصص کے لیے حاصل شدہ نفع ناجائز ہوگا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

"وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا" (سورۃ البقرۃ:275)

یعنی: اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا۔

نتیجہ:

اگر کمپنی حلال کاروبار پر قائم ہے اور اس کے تمام معاملات شرعی اصولوں کے مطابق ہیں، تو حاملانِ حصص کے لیے نفع لینا جائز ہے۔ تاہم، اگر کمپنی سودی یا حرام کاروبار کرتی ہے، تو اس کا نفع لینا ناجائز ہوگا۔

سرمایہ کے نہ ہونے کی صورت میں کمپنی کے مالکان کی ذمہ داری

سوال: (4)

کیا ایسی کمپنی کے مالکان دیانۃً قرض خواہوں اور دائنین کے حقوق سے صرف یہ کہہ کر بری ہوجائیں گے کہ کمپنی کے پاس سرمایہ نہیں ہے؟

جواب:(4)

کمپنی کے مالکان کا دیانۃً ذمہ داری سے بری ہونے کا حکم:

کمپنی کے مالکان (شیئر ہولڈرز) کا صرف یہ کہہ دینا کہ کمپنی کے پاس سرمایہ نہیں ہے، کیا دیانۃً قرض خواہوں (Creditors) اور دائنین کے حقوق سے بری الذمہ ہونے کے لیے کافی ہوگا یا نہیں، اس سوال کا جواب شریعت کے اصولوں اور فقہ حنفی کی روشنی میں درج ذیل نکات کی وضاحت کے ساتھ دیا جاتا ہے۔

ا- دیانۃً اور قانوناً ذمہ داری:

اسلامی شریعت میں قرض ایک ذمہ داری ہے جس کی ادائیگی واجب ہے۔ قرآن مجید میں واضح حکم دیا گیا ہے:

"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا" (سورۃ النساء:58)

یعنی: بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل تک پہنچاؤ۔

فقہ حنفی کے اصول:

فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول یا انکار کرنا ظلم ہے، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں ہے:

"مَطْلُ الغَنِيِّ ظُلْمٌ" (صحیح بخاری، حدیث:2400، صحیح مسلم، حدیث:1564)

یعنی: صاحب استطاعت کا قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔

کمپنی کے مالکان کی ذمہ داری:

کمپنی کے مالکان (شیئر ہولڈرز) محدود ذمہ داری کے اصول کے تحت قانونی طور پر کمپنی کے قرض کے ذمہ دار نہیں ہوتے، لیکن دیانۃً ان پر لازم ہے کہ وہ قرض خواہوں کے حقوق کی ادائیگی کا بندوبست کریں، خصوصاً جب وہ جانتے ہوں کہ کمپنی کے دیوالیہ ہونے کی وجہ سے قرض خواہوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

۲-فقہ حنفی میں شریعت کا اصول:

فقہ حنفی میں یہ اصول موجود ہے کہ کسی کا حق دبانا یا اس کی ادائیگی سے جان بوجھ کر انکار کرنا ناجائز ہے، چاہے وہ مال ذاتی طور پر ان کے پاس نہ ہو۔ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"من كانت عليه ديون فعليه قضاؤها من ماله إن كان له مال، وإلا فهو ضامن متى ما قدر" (ردالمحتار، جلد 5، صفحہ 226، مطبع دارالفکر، بیروت)

یعنی: جس پر قرض ہو، اس کے ذمے اس کی ادائیگی واجب ہے اگر اس کے پاس مال موجود ہو۔ اور اگر مال نہ ہو تو وہ جب بھی استطاعت پائے، ادا کرنے کا پابند ہوگا۔

محدود ذمہ داری کے اصول کی دیانتی حیثیت:

شرعی نقطۂ نظر سے محدود ذمہ داری کا یہ مطلب نہیں کہ قرض خواہوں کے حقوق ضائع ہو جائیں۔ اگر کمپنی کے مالکان کو علم ہو کہ کمپنی کے پاس وسائل نہیں ہیں،

لیکن وہ ذاتی طور پر وسائل رکھتے ہیں، تو دیانۃً ان پر قرض خواہوں کے حقوق کی ادائیگی لازم ہوگی، کیونکہ حقوق العباد کو ضائع کرنا ناجائز ہے۔

۳-حقوق العباد کی اہمیت:

اسلامی شریعت میں حقوق العباد کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اگر مالکان کے پاس ذاتی وسائل موجود ہوں، تو ان کا صرف یہ کہنا کہ کمپنی کے پاس سرمایہ نہیں ہے کافی نہیں ہوگا، بلکہ انہیں کوشش کرنی ہوگی کہ قرض خواہوں کو ان کے حقوق ادا کیے جائیں۔

علامہ سرخسی فرماتے ہیں:

"والظلم فی منع الحقوق أقبح الأمور، فإنه يوجب فساد المعاملات والعداوة بين الناس" (المبسوط، جلد 12، صفحہ 34، مطبع دار المعرفۃ، بیروت)

یعنی: حقوق کی ادائیگی سے انکار کرنا بدترین ظلم ہے، کیونکہ یہ معاملات کے فساد اور لوگوں کے درمیان عداوت کا سبب بنتا ہے۔

۴-قانونی اور دیانتی فرق:

کمپنی کے مالکان قانونی طور پر محدود ذمہ داری کے تحت قرض کی ادائیگی سے بری ہو سکتے ہیں، لیکن دیانۃً وہ بری الذمہ نہیں ہوں گے، کیونکہ شرعی اصولوں کے مطابق:

۱-قرض خواہوں کے حقوق کی ادائیگی واجب ہے۔

۲-مالکان کو اپنی ذاتی استطاعت کے مطابق قرض خواہوں کی ادائیگی کی کوشش کرنی ہوگی۔

نتیجہ:

اسلامی شریعت اور فقہ حنفی کی روشنی میں ایسی کمپنی کے مالکان صرف یہ کہہ کر دیانۃً قرض خواہوں کے حقوق سے بری نہیں ہو سکتے کہ کمپنی کے پاس سرمایہ نہیں ہے، خاص طور پر اگر مالکان کے پاس ذاتی وسائل موجود ہوں۔ان پر لازم ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق قرض خواہوں کے حقوق ادا کریں، کیونکہ حقوق العباد کی ادائیگی شرعی طور پر لازم ہے۔

کمپنی کے مالکان کی فوتگی کے بعد ورثاء کی ذمہ داری

سوال:(5)

ایسی کمپنی کے مالکان کی وفات کے بعد ورثا کا قرض خواہوں اور دائنین کے تئیں کیا ذمہ داری عائد ہوگی؟

جواب:(5)

وفات کے بعد ورثاء کی قرض خواہوں کے حقوق سے متعلق ذمہ داری:

اگر کمپنی کے مالکان وفات پا جائیں اور کمپنی پر قرض باقی ہو، تو اسلامی

شریعت اور فقہ حنفی کے اصولوں کے مطابق مالکان کے ورثاء پر قرض خواہوں کے تئیں درج ذیل احکام وضوابط لاگو ہوں گے:

ا-قرض کی ادائیگی کا عمومی اصول:

شریعت میں میت کی وفات کے بعد سب سے پہلی ترجیح قرض کی ادائیگی کو دی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ" (سورۃ النساء: 11)

یعنی: وصیت پوری کرنے یا قرض ادا کرنے کے بعد۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ میت کے ترکے سے سب سے پہلے اس کے قرض ادا کیے جائیں گے۔

۲-ورثاء کی ذمہ داری:

(الف) میت کے ترکے سے قرض کی ادائیگی:

فقہ حنفی میں اصول یہ ہے کہ اگر مرنے والے شخص کے ذمہ قرض ہو، تو اس کی ادائیگی سب سے پہلے اس کے ترکے (جائیداد) سے کی جائے گی۔ امام کاسانی فرماتے ہیں:

"الديون مقدمة على الإرث، لأن الحقوق متعلقة بعين المال، فتقدم على حقوق الورثة" (بدائع الصنائع، جلد 6، صفحہ 53، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

یعنی: قرضے وراثت پر مقدم ہیں، کیونکہ حقوق مال کی ذات سے متعلق

ہوتے ہیں، اس لیے ورثاء کے حقوق پر مقدم ہیں۔

(ب) اگر ترکہ کافی نہ ہو:

اگر میت کے ترکے میں اتنا مال موجود نہ ہو کہ قرض ادا کیا جا سکے، تو ورثاء پر شرعی طور پر لازم نہیں کہ وہ اپنی ذاتی جائیداد سے قرض ادا کریں، البتہ اگر وہ اپنی خوش دلی اور دیانت داری سے قرض ادا کریں، تو یہ ایک نیکی اور اجر کا باعث ہوگا۔

علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

"فإن لم يترك مالاً، فلا يلزم الورثة أداء ديونه من أموالهم الخاصة" (ردالمحتار، جلد 4، صفحہ 302، مطبع دارالفکر، بیروت)

یعنی: اگر میت کوئی مال نہ چھوڑے، تو ورثاء پر لازم نہیں کہ وہ اپنی ذاتی اموال سے اس کا قرض ادا کریں۔

(ج) ورثاء کے لیے دیانتی پہلو:

اگر میت کے ورثاء کو علم ہو کہ قرض خواہوں کا حق مارا جا رہا ہے اور ان کے پاس استطاعت ہو، تو دیانۃً ان کے لیے قرض ادا کرنا بہتر اور پسندیدہ عمل ہے۔

حدیث مبارکہ میں ہے:

"من أخذ أموال الناس يريد أدائها أدى الله عنه، ومن أخذ يريد إتلافها أتلفه الله" (صحیح بخاری، حدیث: 2387)

یعنی: جو شخص لوگوں کے مال اس نیت سے لے کہ اسے ادا کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا، اور جو ہلاک کرنے کی نیت رکھے، اللہ اسے ہلاک کرے گا۔

۳- کمپنی کے مالکان کے ورثاء کی مخصوص صورت:

(الف) محدود ذمہ داری کی صورت:

اگر کمپنی محدود ذمہ داری (Limited Liability) پر قائم تھی اور قانونی طور پر ورثاء کو کمپنی کے قرضوں کی ادائیگی کا پابند نہیں کیا جا سکتا، تو شرعی اصولوں کے مطابق بھی ورثاء صرف اس ترکے سے قرض ادا کرنے کے پابند ہوں گے جو میت چھوڑ کر گیا ہو۔

(ب) اگر کمپنی دیوالیہ ہو:

اگر کمپنی دیوالیہ ہو چکی ہو اور میت کے ترکے میں کوئی مال نہ ہو، تو ورثاء دیانۃً قرض خواہوں کے حقوق ادا کرنے کے پابند نہیں، لیکن اگر وہ اپنی خوش دلی اور تعاون سے قرض ادا کریں، تو یہ اجر عظیم کا باعث ہوگا۔

۴- فقہ حنفی کے نظائر:

(الف) قرض کی ذمہ داری ورثاء پر کب عائد ہوتی ہے؟

فقہ حنفی کے مطابق قرض کی ادائیگی میت کے مال سے ہوتی ہے۔ اگر میت کے مال سے قرض ادا نہ ہو سکے، تو ورثاء اپنی ذاتی حیثیت میں دیانۃً ذمہ دار نہیں ہوتے۔

جیسا کہ علامہ مرغینانی فرماتے ہیں:

"فإن لم يترك شيئاً سقط الدين، ولا يلزم الوارث شيء"

(الهداية، جلد 3، صفحہ 193، مطبع دار احیاء التراث العربی، بیروت)

یعنی: اگر میت کوئی چیز نہ چھوڑے، تو قرض ساقط ہو جاتا ہے اور وارث پر کوئی چیز لازم نہیں ہوتی۔

(ب) ورثاء کے لیے مستحب عمل:

فقہاء نے ورثاء کے لیے مستحب قرار دیا ہے کہ اگر وہ استطاعت رکھتے ہوں، تو قرض خواہوں کے حقوق ادا کریں، کیونکہ یہ ایک اخلاقی فریضہ ہے۔

نتیجہ:

۱-اگر میت کے مال سے قرض خواہوں کے حقوق ادا ہو سکتے ہیں، تو سب سے پہلے یہ حقوق ادا کیے جائیں گے، پھر بقیہ مال ورثاء میں تقسیم ہوگا۔
۲-اگر میت نے کوئی مال نہیں چھوڑا، تو ورثاء پر شرعی طور پر قرض کی ادائیگی لازم نہیں، البتہ دیانۃً اور اخلاقاً قرض ادا کرنا افضل اور اجر کا باعث ہے۔
۳-محدود ذمہ داری کے اصول کے تحت ورثاء قانونی طور پر بری ہو سکتے ہیں، لیکن شریعت میں حقوق العباد کی ادائیگی دیانت داری کے ساتھ ترجیحی عمل ہے۔

کمپنی کو قرض دینے، سامان دینے و لینے کا حکم

سوال: (6)

اس طرح کمپنی کو قرض دینا اس کو سامان سپلائی کرنا اس کی مصنوعات خریدنا شرعاً کیسا ہے؟ جائز یا ناجائز؟

جواب:(6)

کمپنی کو قرض دینا، سامان سپلائی کرنا اور اس کی مصنوعات خریدنے کا شرعی حکم:

اسلامی شریعت اور فقہ حنفی کے اصولوں کی روشنی میں کسی کمپنی کو قرض دینا، اسے سامان سپلائی کرنا، یا اس کی مصنوعات خریدنا اس وقت جائز ہوگا جب درج ذیل شرائط پوری ہوں:

١- کمپنی کے کاروبار کی نوعیت:

کمپنی کے کاروبار کی نوعیت کا شرعی طور پر جائز ہونا ضروری ہے۔

اگر کمپنی کا کاروبار حلال اشیاء پر مشتمل ہو اور سود، قمار (جوا)، یا حرام مصنوعات سے پاک ہو، تو ایسی کمپنی کو قرض دینا، اس کی مصنوعات خریدنا، اور اس کے ساتھ تجارتی معاملات کرنا جائز ہوگا۔

اگر کمپنی حرام کاروبار میں ملوث ہو، جیسے سودی بینکنگ، شراب، خنزیر، یا دیگر حرام اشیاء کی تجارت، تو اس کے ساتھ تعاون کرنا ناجائز ہوگا، کیونکہ یہ **تعاون علی الإثم** کے زمرے میں آتا ہے، جس سے قرآن کریم میں منع کیا گیا ہے:

"وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (سورۃ المائدہ:2)

یعنی: گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

۲- کمپنی کو قرض دینے کا حکم:

(الف) قرض کا شرعی اصول۔

قرض دینے کا بنیادی مقصد خیر خواہی اور تعاون ہوتا ہے، لیکن شریعت میں یہ ضروری ہے کہ قرض پر سود یا اضافی معاوضہ نہ لیا جائے۔ اگر کمپنی قرض کے بدلے سود کی ادائیگی کرے گی، تو یہ ناجائز ہوگا۔

جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا:

"**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً**" (سورۃ آل عمران:130)

یعنی: اے ایمان والو! دوگنا چوگنا سود نہ کھاؤ۔

(ب) فقہ حنفی کے نظائر۔

علامہ کاسانی قرض کے اصول بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"**القرض مشروع لإرفاق المقترض من غير منفعة يأخذها المقرض**" (بدائع الصنائع، جلد 7، صفحہ 438، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

یعنی: قرض اس لیے مشروع ہے تا کہ قرض لینے والے کی مدد کی جائے، بغیر کسی فائدے کے جو قرض دینے والا حاصل کرے۔

لہٰذا، اگر کمپنی کو بغیر سود کے قرض دیا جائے، تو یہ جائز ہے، بشرطیکہ کمپنی کا کاروبار جائز ہو۔

۳- کمپنی کو سامان سپلائی کرنے کا حکم:

(الف) سامان سپلائی کا عمومی اصول۔

اگر کمپنی کو سپلائی کی جانے والی اشیاء حلال ہیں اور وہ ان اشیاء کو جائز طریقے سے استعمال کرتی ہے، تو کمپنی کو سامان فروخت یا سپلائی کرنا جائز ہوگا۔

(ب) فقہ حنفی کے نظائر۔

علامہ مرغینانی فرماتے ہیں:

"کل بیع جاز فیه العوض جازت المعاملة به، بشرط أن یکون فیه منفعة مباحة" (الهدایہ، جلد 3، صفحہ 34، مطبع دار إحیاء التراث العربی، بیروت)

یعنی: ہر وہ بیع جائز ہے جس میں عوض موجود ہو اور وہ مباح منفعت پر مشتمل ہو۔

۴- کمپنی کی مصنوعات خریدنے کا حکم:

(الف) مصنوعات کی نوعیت کا جائزہ۔

اگر کمپنی کی مصنوعات حلال اور طیب ہیں، تو ان کی خریداری جائز ہے۔

(ب) حرام مصنوعات کی خریداری کا حکم۔

اگر کمپنی حرام مصنوعات تیار کرتی ہے، جیسے شراب، خنزیر کا گوشت، یا سودی مالیاتی مصنوعات، تو ان کی خریداری جائز نہیں ہوگی۔

جیسا کہ فقہاء نے فرمایا ہے:

"الشراء من الحرام لا یجوز، لأنه إعانة علی الحرام" (المبسوط،

جلد 12، صفحہ 213، مطبع دارالمعرفۃ، بیروت)

یعنی: حرام چیزوں کی خریداری جائز نہیں، کیونکہ یہ حرام پر معاونت کے مترادف ہے۔

۵-محدود ذمہ داری (Limited Liability) کا اثر:

اگر کمپنی محدود ذمہ داری کے اصول پر قائم ہو، تو اس کی مالی پوزیشن اور دیوالیہ پن کی صورت میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ:

۱- کمپنی کا کاروبار حلال ہے یا نہیں۔

۲- اس کے ساتھ معاملات کرنے سے کوئی شرعی قباحت پیدا تو نہیں ہوگی۔

نتیجہ:

۱- کمپنی کو قرض دینا جائز ہے، بشرطیکہ یہ بغیر سود کے ہو اور کمپنی کا کاروبار حلال ہو۔

۲- کمپنی کو سامان سپلائی کرنا بھی جائز ہے، بشرطیکہ وہ حلال اشیاء ہوں اور کمپنی ان اشیاء کو جائز مقاصد کے لیے استعمال کرے۔

۳- کمپنی کی مصنوعات خریدنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ مصنوعات شرعی اصولوں کے مطابق حلال ہوں۔

۴- اگر کمپنی کا کاروبار یا مصنوعات حرام ہوں، تو اس کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون ناجائز ہوگا، کیونکہ یہ گناہ میں معاونت کے زمرے میں آتا ہے۔

کمپنی میں ملازمت کا حکم

سوال:(7)

اس کمپنی کے کسی انتظامی عہدے پر ملازمت کرنا یا اس میں بہ طور مزدور کام کرنا شرعا کیسا ہے؟ اور حاصل شدہ اجرت کا کیا حکم ہوگا؟

جواب:(7)

کمپنی میں ملازمت یا مزدوری کرنے اور اجرت کے حکم کا شرعی جائزہ:

اسلامی شریعت اور فقہ حنفی کی روشنی میں کسی کمپنی کے انتظامی عہدے پر ملازمت کرنے یا بہ طور مزدور کام کرنے کا حکم درج ذیل امور پر منحصر ہے:

ا- کمپنی کے کاروبار کی نوعیت:

(الف) حلال کاروبار۔

اگر کمپنی کا کاروبار حلال مصنوعات یا خدمات پر مشتمل ہو اور وہ کسی شرعی ممنوع عمل میں ملوث نہ ہو، تو ایسی کمپنی میں انتظامی عہدے پر ملازمت کرنا یا بہ طور مزدور کام کرنا جائز ہے۔

(ب) حرام کاروبار۔

اگر کمپنی سود، قمار (جوا)، شراب، خنزیر، یا دیگر حرام اشیاء کی تجارت کرتی ہو، یا ایسی خدمات فراہم کرتی ہو جو شرعی طور پر ممنوع ہوں، تو ایسی کمپنی میں ملازمت کرنا یا مزدوری کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ"

(سورۃ المائدہ:2)

یعنی: نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔

۲-ملازمت یا مزدوری کا کردار:

(الف) براہ راست حرام میں معاونت۔

اگر ملازمت کا کردار براہ راست کسی حرام عمل میں معاون ہو، جیسے سودی لین دین کے معاہدات تیار کرنا، شراب کی خرید وفروخت کے انتظامات کرنا، یا حرام اشیاء کی تشہیر کرنا، تو یہ ملازمت ناجائز ہوگی۔

(ب) غیر مستقیم تعلق۔

اگر ملازمت کا کردار براہ راست حرام کاموں سے متعلق نہ ہو، بلکہ عمومی انتظامی یا عملی خدمات ہوں، جیسے صفائی کا کام، تکنیکی امور، یا دیگر خدمات جو حرام سے براہ راست تعلق نہ رکھتی ہوں، تو ایسی صورت میں علماء کا اختلاف ہے، تاہم احتیاط یہی ہے کہ ایسی ملازمت سے بھی اجتناب کیا جائے۔

۳-فقہ حنفی کے نظائر:

(الف) مباح ملازمت کا اصول۔

فقہ حنفی کے مطابق اجرت پر مبنی خدمات اس وقت جائز ہیں، جب وہ کسی حرام کام میں معاون نہ ہوں۔علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

"کل ما یحل الانتفاع به یحل بیعه وإجارته، لأن المنافع بمنزلة الأعیان" (بدائع الصنائع،جلد4،صفحہ174،مطبع دارالکتب العلمیۃ،بیروت)

یعنی: ہر وہ چیز جس سے فائدہ اٹھانا جائز ہو، اس کی بیع اور اجرت بھی جائز ہے، کیونکہ منافع اشیاء کے مانند ہیں۔

لہٰذا، حلال کاموں کے لیے اجرت لینا جائز ہے۔

(ب) حرام کام کے لیے اجرت۔

حرام کام کے لیے اجرت لینا ناجائز ہے، جیسا کہ علامہ مرغینانی لکھتے ہیں:

"کل عقد یشتمل علی المعصیة فهو باطل، فلا یستحق به الأجر" (الہدایہ،جلد2،صفحہ588،مطبع دار إحیاء التراث العربی،بیروت)

یعنی: ہر وہ معاہدہ جو گناہ پر مشتمل ہو، وہ باطل ہے اور اس پر اجرت کا حق نہیں۔

۴-حاصل شدہ اجرت کا حکم:

(الف) جائز ملازمت کی اجرت۔

اگر ملازمت یا مزدوری کسی حلال کام پر مشتمل ہو، تو اس کی حاصل شدہ

اجرت حلال ہوگی۔

(ب) حرام ملازمت کی اجرت۔

اگر ملازمت کسی حرام کام میں معاونت پر مبنی ہو، تو اس کی حاصل شدہ اجرت ناجائز ہوگی۔ حدیث مبارکہ میں ہے:

"إِنَّ اللَّهَ إِذَا حَرَّمَ شَيْئًا حَرَّمَ ثَمَنَهُ" (سنن ابن ماجہ، حدیث:2153)

یعنی: جب اللہ کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے، تو اس کی قیمت (آمدنی) کو بھی حرام قرار دیتا ہے۔

۵-احتیاطی پہلو:

(الف) شبہ سے بچنے کی تاکید۔

اگر کمپنی کے کاروبار میں حلال اور حرام دونوں شامل ہوں، تو اس کے ساتھ ملازمت یا کام کرنے سے بچنا بہتر ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے شبہات سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے:

"دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ" (سنن الترمذی، حدیث:2518)

یعنی: جو چیز تمہیں شبہ میں ڈالے، اسے چھوڑ کر وہ اختیار کرو جو تمہیں شبہ میں نہ ڈالے۔

نتیجہ:

۱-اگر کمپنی کا کاروبار مکمل طور پر حلال ہو، تو اس میں انتظامی عہدے پر

ملازمت کرنا یا بہ طور مزدور کام کرنا اور اس کی حاصل شدہ اجرت جائز ہوگی۔

۲-اگر کمپنی کا کاروبار حرام ہو یا ملازمت کا کردار براہ راست کسی حرام کام میں معاونت کرتا ہو، تو ایسی ملازمت یا کام کرنا ناجائز ہوگا، اور اس کی اجرت بھی حرام ہوگی۔

۳-اگر کمپنی کے کاروبار میں حلال وحرام کا اختلاط ہو، تو شبہات سے بچتے ہوئے ایسی ملازمت سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

زکوۃ کی ادائیگی اور شخص قانونی کے اصول کا جائزہ

سوال: (8)

شخص قانونی کے اصول پر مبنی ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ تنظیموں (جن کے تحت اسکول اور ہسپتال وغیرہ چلتے ہیں) کے پاس زکاۃ کی رقم آتی ہے، بعض جگہ ان کا طریقہ کار یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مستحق زکاۃ شخص کے بچے ان کے اسکول میں پڑھتے ہیں یا ان (مستحقین) کا علاج تنظیم کے ہسپتال میں ہوتا ہے، جب بل یا فیس کی ادائیگی کا نمبر آتا ہے تو مستحق سے ایک تحریر لے لی جاتی ہے کہ میرا بل یا میری فیس متعلقہ ہسپتال اور اس کو مد زکاۃ سے ادا کر دی جائے؛ چنانچہ انتظامیہ اتنی رقم زکاۃ فنڈ اسپتال کے یا اسکول کے جنرل فنڈ میں منتقل کر دیتی ہے، پھر اس رقم سے انتظامی اخراجات پورے کئے جاتے ہیں اور تنخواہوں کی ادائیگی کی جاتی ہے، اب اس امر کی تحقیق کی ضرورت ہے کہ کیا ایسا کرنے سے معطین کی زکاۃ ادا ہو جائے گی؟

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ تنظیم کا ایک مستقل قانونی وجود ہے اور وہ دائن بھی ہوسکتی ہے؛لہذا جب ذمے دار نے مدیون (فقراء) کی اجازت سے تنظیم کے ہسپتال (جواس کا دائن ہے) کے جنرل فنڈ میں رقم دے دی تو ذمے دار کا ذمہ فارغ ہوگیا اور معطین کی زکاۃ ادا ہوگئی؟

یا یہ کہا جائے گا کہ ابھی تک زکاۃ ادانہیں ہوئی؛ کیوں کہ ذمے دار چوں کہ ایک ہےتو یہ گویا ایسا ہوگیا جیسے ایک جیب سے دوسرے جیب میں منتقل کردیا؟

جواب:(8)

زکاۃ کی ادائیگی اورشخصِ قانونی کے اصول کا جائزہ:

زکاۃ کی ادائیگی کا اصل مقصد فقرا ومساکین کو مالی امداد فراہم کرنا ہے تا کہ ان کی بنیادی ضروریات پوری ہوں۔زکاۃ ادا ہونے کے لیےضروری ہے کہ زکاۃ کا مال شرعی مستحقین (مثلاً فقرا، مساکین، غارمین وغیرہ) کی ملکیت میں پہنچے۔تنظیموں اوراداروں کی طرف زکاۃ کی رقم کا استعمال کرتے ہوئے جوطریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کا جائزہ درج ذیل نکات کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے:

۱-زکاۃ کی ادائیگی کا بنیادی اصول:

فقہ حنفی کے مطابق زکاۃ اس وقت ادا ہوتی ہے جب:

۱-زکاۃ کی رقم حقیقی طور پر مستحق کی ملکیت میں منتقل ہو۔

۲- مستحق زکاۃ کا اختیار اس رقم پر مکمل ہو جائے، تا کہ وہ اس رقم کو اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کر سکے۔

فقہ حنفی کی عبارت:

علامہ کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ولا يجوز دفع الزكاة إلى غيره من القُربات، كالإصلاح بين الناس، وبناء المساجد والقناطر، ودفن الموتى، وتكفينهم؛ لأن هذه ليست من جنس الأخذ المذكور في الآية، وهو قوله تعالى: (إنما الصدقات للفقراء والمساكين)" (بدائع الصنائع، جلد 2، صفحہ 398، مطبع دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

یعنی: زکاۃ کو دیگر نیکی کے کاموں میں، جیسے مصالحت کرانا، مساجد یا پل بنوانا، یا مردوں کی تدفین میں خرچ کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ اس اخذ کے دائرے میں نہیں آتا جس کا ذکر قرآن میں ہے۔

۲- شخص قانونی کا اصول اور اس کی حیثیت:

تنظیم یا ادارے کو شخص قانونی ماننا جدید قانونی اصول ہے، مگر فقہ اسلامی میں زکاۃ کی وصولی اور خرچ کا معاملہ حقیقی افراد (مستحقین زکاۃ) کے ساتھ مربوط ہے۔

اگر زکاۃ کی رقم مستحق زکاۃ کی اجازت سے تنظیم کے اکاؤنٹ میں منتقل کی جاتی ہے، اور وہ رقم براہ راست مستحق کی ضرورت کے لیے استعمال ہوتی ہے، تو زکاۃ ادا ہو سکتی ہے۔

لیکن اگر وہ رقم مستحق کی ملکیت میں منتقل کیے بغیر تنظیم کے عمومی اخراجات، تنخواہوں، یا دیگر مدات میں استعمال ہو، تو یہ طریقہ شرعی طور پر زکاۃ کی ادائیگی کے اصول کے خلاف ہوگا۔

فقہ حنفی کا اصول:

زکاۃ کی رقم کا مستحق کی ملکیت میں جانا ضروری ہے، جیسا کہ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"الملک شرط فی أداء الزکاة، فلا یجوز صرفها فی غیر ملک المستحقین" (ردالمحتار، جلد 2، صفحہ 342، مطبع دار إحیاء التراث العربی، بیروت)

یعنی: زکاۃ کے ادا ہونے کے لیے ملکیت شرط ہے، لہٰذا اسے مستحقین کی ملکیت کے علاوہ کسی اور جگہ خرچ کرنا جائز نہیں۔

۳-زکاۃ کی رقم کے تنظیم کے جنرل فنڈ میں منتقل کرنے کا حکم:

(الف) مستحق سے اجازت لینے کی حیثیت۔

اگر مستحق زکاۃ کی اجازت لی جاتی ہے کہ اس کی زکاۃ تنظیم کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی جائے تا کہ اس کی ضرورت پوری کی جا سکے، تو شرعی طور پر اس اجازت کی حیثیت صرف اس وقت معتبر ہوگی جب:

۱-رقم حقیقتاً مستحق کے فائدے کے لیے خرچ ہو۔

۲-مستحق کو یہ واضح طور پر معلوم ہو کہ یہ رقم کس مد میں خرچ ہوگی۔

(ب) جنرل فنڈ میں منتقل کرنا۔

تنظیم کے جنرل فنڈ میں زکاۃ کی رقم منتقل کرنا اور پھر اس رقم کو تنخواہوں یا انتظامی اخراجات میں استعمال کرنا شرعی اصول کے خلاف ہوگا، کیونکہ زکاۃ کی رقم کا عمومی مصرف صرف مستحقین کی ملکیت ہے۔

فقہ حنفی کے مطابق، زکاۃ کو غیر مستحقین یا غیر ضروری مدات میں خرچ کرنا زکاۃ کی ادائیگی کو باطل کر دیتا ہے۔

۴- ایک جیب سے دوسری جیب کی مثال کا اطلاق۔

اگر تنظیم کے ذمہ داران زکاۃ کی رقم کو ایک اکاؤنٹ سے دوسرے اکاؤنٹ میں منتقل کرتے ہیں، اور اصل رقم مستحقین تک نہیں پہنچتی، تو یہ ایک جیب سے دوسری جیب میں منتقل کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس صورت میں زکاۃ ادا نہیں ہوگی۔

فقہ حنفی کی وضاحت:

علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں:

"فإن لم يقبض الفقير المال أو لم يكن المال تحت تصرفه، لايصح أداء الزكاة" (ردالمحتار، جلد 2، صفحہ 341، مطبع دار إحياء التراث العربي، بیروت)

یعنی: اگر فقیر مال کو قبضہ میں نہ لے یا وہ مال اس کے تصرف میں نہ ہو، تو زکاۃ ادا نہیں ہوگی۔

۵- تنظیم کو دائن ماننے کا مسئلہ:

تنظیم کو دائن ماننا فقہ اسلامی میں ایک نئی قانونی تعبیر ہے، لیکن زکاۃ کے حوالے سے دائن اور مدیون کا تعلق اس وقت شرعی طور پر درست ہوگا، جب مستحق (مدیون) کی ملکیت کو ترجیح دی جائے۔

مستحق زکاۃ کو حقیقی طور پر زکاۃ کی رقم کا مالک بنانا ضروری ہے۔

تنظیم کو دائن مان کر مستحق کی زکاۃ کی رقم براہ راست تنظیم کے فنڈ میں ڈال دینا اس وقت تک شرعی طور پر معتبر نہیں ہوگا جب تک مستحق کا مکمل اختیار اور قبضہ نہ ہو۔

نتیجہ:

۱- زکاۃ کی ادائیگی اس وقت معتبر ہوگی جب زکاۃ کی رقم مستحقین کی ملکیت میں منتقل ہو، یا وہ رقم براہ راست مستحقین کی ضروریات پر خرچ کی جائے۔

۲- تنظیم کے جنرل فنڈ میں زکاۃ کی رقم منتقل کر کے اسے تنخواہوں یا انتظامی اخراجات میں استعمال کرنا جائز نہیں، اور اس طریقے سے زکاۃ ادا نہیں ہوگی۔

۳- تنظیم کو دائن ماننے اور مستحق سے اجازت لینے کے باوجود زکاۃ کی رقم کا مستحقین کی ملکیت میں منتقل ہونا ضروری ہے۔

۴- زکاۃ کی ادائیگی کا یہ طریقہ (رقم کو تنظیم کے جنرل فنڈ میں ڈالنا) ایک جیب سے دوسری جیب کے مترادف ہوگا، اور اس سے زکاۃ ادا نہیں ہوگی۔

☆☆☆

یسر وتیسیر اور عصرِ حاضر کے تقاضے

تیسیر کا مفہوم اور اس کی حکمت

سوال:(1)

شریعت اسلامی میں تیسیر کس کو کہتے ہیں؟ اور اس کی کیا حکمت ہے؟ اس بارے میں اصولیین کی گفتگو کا خلاصہ کیا ہے؟

جواب:(1)

تیسیر کا مفہوم:

شریعت اسلامی میں تیسیر سے مراد ایسی آسانی فراہم کرنا ہے جو دین کے بنیادی اصولوں اور مقاصدِ شریعت (مصلحتِ عامہ، دفعِ حرج، اور جلبِ منفعت) کے تحت ہو، تاکہ بندگانِ خدا کے لیے دین پر عمل کرنا دشوار نہ ہو۔ قرآن وسنت میں واضح دلائل موجود ہیں جو اس بات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ اللہ تعالی نے دین کو آسان بنایا اور اس میں حرج کو رفع کیا ہے۔

قرآنی دلیل:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"**یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر**" (البقرۃ:185)

ترجمہ: "اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تنگی نہیں چاہتا"۔

حدیث نبوی:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"**إنما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین**" (صحیح بخاری، حدیث:69)

ترجمہ: "تمہیں آسانیاں فراہم کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے، نہ کہ سختیاں پیدا کرنے والا"۔

تیسیر کی حکمت:

تیسیر کی بنیادی حکمت یہ ہے کہ:

۱-شریعت کی جامعیت اور عالمگیریت کو برقرار رکھا جائے تا کہ ہر طبقہ اور ماحول کے لوگ اس پر عمل کر سکیں۔

۲-انسان کی فطری کمزوریوں اور عملی مشکلات کو مدنظر رکھا جائے۔

۳-دین پر عمل کو آسان بنایا جائے تا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت

سے قریب ہو سکیں۔

فقہاء و اصولیین کی گفتگو کا خلاصہ:

اصولیین کے ہاں ''تیسیر'' کا اصول ''رفع الحرج'' کے قاعدے کے تحت آتا ہے۔امام شاطبی رحمہ اللہ نے اس کو مقاصد الشریعہ کا ایک اہم حصہ قرار دیا ہے۔فقہ حنفی میں یہ اصول واضح ہے کہ:

۱-ضرورت و اضطرار کی حالت میں سخت احکام میں تخفیف کی جاتی ہے۔

۲-عرف اور عادت کو مدنظر رکھتے ہوئے سہولت فراہم کی جاتی ہے۔

۳-ایسے حالات میں ''دفعِ ضرر'' اور ''تحصیلِ منفعت'' کو اہمیت دی جاتی ہے۔

فقہ حنفی کی مستند کتب سے دلائل:

۱-الدر المختار

''**و المشقة تجلب التيسير**'' (الدر المختار، جلد 1، صفحہ 94، مطبع دار الفکر بیروت)

ترجمہ: ''مشقت آسانی کو واجب کر دیتی ہے''۔

۲-بدائع الصنائع

''**إن الشرع وضع لدفع الحرج، فإذا اشتد الضرر خفف الحكم**'' (بدائع الصنائع، جلد 4، صفحہ 189، مطبع دار الکتب العلمیہ)

ترجمہ: ''شریعت حرج کو ختم کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے، لہٰذا جب بھی ضرر شدید ہو، حکم میں تخفیف کی جاتی ہے''۔

۳-ردالمحتار

''إن من مقاصد الشريعة رفع الحرج و التيسير على الناس''

(ردالمحتار، جلد 6، صفحہ 52، مطبع داراحیاء التراث العربی)

ترجمہ: ''شریعت کے مقاصد میں سے ایک مقصد حرج کو ختم کرنا اور لوگوں کے لیے آسانی فراہم کرنا ہے''۔

خلاصہ:

تیسیر شریعت کے ان اصولوں میں سے ہے جو انسان کے عملی اور فطری حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے احکام میں سہولت فراہم کرتا ہے۔اس کا مقصد لوگوں کو دین سے قریب کرنا اور ان پر عمل کو آسان بنانا ہے، جیسا کہ قرآن وسنت اور فقہ حنفی کی معتبر کتب سے ثابت ہے۔

تیسیر کے اسباب اور دائرہ کیا ہے؟

سوال: (2)

شریعت اسلامی میں تیسیر کی بنیادیں کیا ہیں؟ نیز تیسیر کے اسباب کیا ہیں؟

اور اس کا دائرہ کیا ہے؟

جواب:(2)

شریعت اسلامی میں تیسیر (آسانی) ایک اہم اصول ہے، جس کا مقصد بندوں کو ان کے معاملات میں سہولت فراہم کرنا اور ان پر غیر ضروری سختی کو ختم کرنا ہے۔تیسیر کی بنیادیں قرآن وسنت میں موجود ہیں، اور یہ اصول فقہ اسلامی کے تمام مکاتبِ فکر میں تسلیم شدہ ہے، خاص طور پر فقہ حنفی میں۔

تیسیر کی بنیادیں:

۱-قرآن مجید کی تعلیمات:

قرآن مجید میں متعدد آیات تیسیر کے اصول کو واضح کرتی ہیں، جیسے:

"يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" (سورۃ البقرۃ:185)

ترجمہ: اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔

"وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ" (سورۃ الحج:78)

ترجمہ: اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔

۲-سنت نبوی ﷺ:

نبی کریم ﷺ نے تیسیر کو اپنی دعوت اور عمل میں ہمیشہ ترجیح دی:

"يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا" (صحیح بخاری:69)

ترجمہ: آسانی کرو اور سختی نہ کرو۔

تیسیر کے اسباب:

فقہ اسلامی میں تیسیر کے اسباب درج ذیل ہیں:

۱-عذر یا مشقت:

جب کوئی شخص کسی عذر یا مشقت کی بنا پر کسی حکم کو پورا کرنے سے قاصر ہو تو شریعت آسانی فراہم کرتی ہے، جیسے بیمار کے لیے روزہ معاف کرنا یا مسافر کو نماز میں قصر کی اجازت دینا۔

۲-ضرورت یا حاجت:

ضرورت کے تحت بعض اوقات سخت احکام میں نرمی کی جاتی ہے۔ جیسے اضطراری حالت میں حرام چیزوں کا استعمال جائز ہو جاتا ہے:

"فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ" (سورۃ البقرۃ:173)

۳-عرف وعادت:

عرف اور لوگوں کی عادات کا بھی تیسیر میں لحاظ رکھا جاتا ہے، جیسا کہ فقہ حنفی میں عرف کے اصول کو معتبر سمجھا گیا ہے۔

۴-وقت یا حالات کی تبدیلی:

حالات کے بدلنے سے بھی بعض امور میں آسانی دی جاتی ہے۔

تیسیر کا دائرہ:

تیسیر کا دائرہ وہ تمام معاملات ہیں جن میں:

۱-شریعت کی روح کے خلاف نہ ہو۔

۲-کسی واجب کو ساقط نہ کرے۔

۳-حرام کو حلال یا حلال کو حرام نہ کرے۔

فقہ حنفی میں تیسیر کے حوالے سے عبارات:

۱-علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"إنَّ الأحكامَ تُبنى على رفع الحرج والتيسير على العباد بحسب الإمكان" (ردالمحتار علی الدر المختار، ج6،ص66، دار الفکر بیروت)

ترجمہ: احکام حرج کے ازالے اور بندوں پر ممکنہ حد تک آسانی فراہم کرنے پر مبنی ہیں۔

۲-امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"الأصل فی الشریعة رفع الحرج عن الناس والتخفیف علیهم" (المبسوط، ج3،ص109، دار المعرفۃ بیروت)

ترجمہ:شریعت کا اصل مقصد لوگوں سے حرج کو ختم کرنا اور ان پر تخفیف کرنا ہے۔

۳-امام مرغینانیؒ فرماتے ہیں:

"ولیس فی الدین ما یؤدی إلی المشقة علی العباد" (الھدایۃ، ج 1، ص 202، داراحیاء التراث العربی بیروت)

ترجمہ: دین میں کوئی ایسی بات نہیں جو بندوں پر مشقت ڈالے۔

نتیجہ:

شریعت اسلامی میں تیسیر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہے، جس کا مقصد انسانوں کے لیے دین کو قابلِ عمل اور آسان بنانا ہے، تاکہ وہ احکامِ شریعت کو خوش دلی سے قبول کرسکیں۔تاہم، تیسیر کا اطلاق ان اصولوں کے تحت ہوگا جو شریعت نے خود مقرر کیے ہیں۔

تیسیر کے بارے میں کتاب وسنت وصحابہ کی رہنمائی

سوال:(3)

تیسیر کے بارے میں کتاب وسنت اور صحابہ کرام کے طریقہ کار سے کیا رہنمائی ملتی ہے؟

جواب:(3)

تیسیر (آسانی) دین اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے، اور قرآن وسنت میں اس کی صراحت کے ساتھ تلقین کی گئی ہے۔ شریعت اسلامی کا یہ عمومی مزاج ہے کہ وہ بندوں کے لیے سہولت اور آسانی پیدا کرتی ہے اور ان پر مشقت اور تنگی مسلط نہیں کرتی۔ قرآن کریم، احادیثِ مبارکہ، اور فقہِ حنفی کی مستند کتابوں سے اس بارے میں درج ذیل رہنمائی ملتی ہے:

قرآن کریم سے رہنمائی:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"**يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ**" (البقرہ:185)

ترجمہ: اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے دشواری نہیں چاہتا۔

نیز فرمایا:

"**مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ**" (الحج:78)

ترجمہ: اس نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔

احادیثِ مبارکہ سے رہنمائی:

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

"**إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ**" (صحیح بخاری، حدیث:39)

ترجمہ: دین آسان ہے، اور جو شخص دین میں سختی کرے گا، دین اس پر غالب آجائے گا۔

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

"يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا، وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا" (صحیح بخاری، حدیث: 69)

ترجمہ: آسانی کرو اور سختی نہ کرو، خوشخبری دو اور لوگوں کو متنفر نہ کرو۔

صحابہ کرام کے طریقہ سے رہنمائی:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"لَا تُشَدِّدُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ فَيُشَدَّدَ عَلَيْكُمْ" (مصنف ابن أبی شیبۃ، حدیث: 28711)

ترجمہ: اپنے اوپر سختی مت کرو، ورنہ تم پر سختی کی جائے گی۔

فقہِ حنفی کی مستند کتب سے حوالہ جات:

فقہِ حنفی میں بھی تیسیر کے اصول کو خاص اہمیت دی گئی ہے، جیسا کہ علامہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں:

"الأَصلُ فِي الأَحكَامِ الرُّخصَةُ وَالتَّيسِيرُ فِي حَالِ الضَّرُورَةِ"

(رد المحتار علی الدر المختار، جلد: 1، صفحہ: 175، دار الفکر بیروت)

ترجمہ: احکام میں اصل ضرورت کے وقت رخصت اور آسانی ہے۔

ایک اور فقہی اصول:

علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں:

"إِنَّ الشَّرِيعَةَ وُضِعَتْ لِرَفْعِ الْحَرَجِ وَالتَّيْسِيرِ عَلَى الْعِبَادِ"

(الموافقات، جلد:1 ،صفحہ:213 ،دارابن عفان)

ترجمہ: شریعت بندوں سے حرج کو ختم کرنے اور ان پر آسانی فراہم کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے۔

نتیجہ:

اسلامی تعلیمات کے مطابق دین کی بنیاد آسانی اور سہولت پر رکھی گئی ہے۔ قرآن، سنت، اور فقہ حنفی کی مستند کتب سب اس پر متفق ہیں کہ عبادات اور معاملات میں جہاں تک ممکن ہو، سہولت اور رخصت کا راستہ اپنایا جائے۔ تیسیر کا یہ اصول نہ صرف شریعت کی حکمتوں میں سے ہے بلکہ ہر دور میں امت کے لیے رحمت کا ذریعہ رہا ہے۔

تیسیر سے متعلق بنیادی اصول وقواعد

سوال:(4)

تیسیر سے متعلق بنیادی اصول وقواعد کیا ہیں؟ اس کی مختصر وضاحت فرمائیں۔

جواب:(4)

تیسیر (آسانی پیدا کرنا) شریعت اسلامیہ کا ایک اہم اصول اور اس کی عظیم خصوصیت ہے، جو اللہ تعالیٰ کی رحمت، بندوں کی سہولت اور دین کے عملی نفاذ کی وضاحت کرتی ہے۔قرآن وحدیث میں متعدد دلائل تیسیر کے اصول کو بیان کرتے ہیں۔ یہاں ان اصول کی وضاحت کے ساتھ فقہ حنفی کی معتبر کتب کے حوالے دیے جا رہے ہیں:

تیسیر کے اصول وقواعد:

۱-رفع الحرج (مشقت کا خاتمہ):

شریعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وہ بندوں پر ایسی ذمہ داری عائد نہیں کرتی جو ان کے لیے نا قابل برداشت ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ'' (سورۃ الحج:78)

یعنی دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی گئی۔

۲-ضرورتِ شدیدہ کی بنا پر رخصت دینا:

ضرورت اور مجبوری کی حالت میں ممنوع چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں، جیسے حالتِ اضطرار میں حرام کھانے کی اجازت۔

فقہاء فرماتے ہیں:

"الضرورات تبیح المحظورات" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، صفحہ 344، مطبع: رشیدیہ کوئٹہ)

۳-عرف وعادت کو اہمیت دینا:

شریعت میں مقامی عرف اور عام عادت کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے، بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو۔

امام کاسانی لکھتے ہیں:

"العادة محكمة" (بدائع الصنائع، جلد7، صفحہ156، مطبع دار الکتب العلمیہ، بیروت)

۴-تکلیف مالا یطاق (نا قابل برداشت حکم کا رفع):

انسان کو ایسا حکم نہیں دیا جاتا جسے وہ ادا نہ کر سکے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (سورۃ البقرۃ:286)

۵-شریعت کے عمومی احکام میں سہولت:

عام حالات میں بھی دین اسلام سہولت فراہم کرتا ہے تا کہ عمل میں آسانی ہو۔

حدیث میں آیا ہے:

"إن الدين يُسرٌ" (صحیح بخاری، حدیث نمبر 39)

فقہ حنفی کی کتب سے حوالے:

۱-امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الأصل أن المشقة تجلب التيسير" (المبسوط، جلد 1، صفحہ 159، مطبع: دارالمعرفۃ، بیروت)

ترجمہ: اصول یہ ہے کہ مشقت آسانی کا سبب بنتی ہے۔

۲-علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

"والشريعة مبناها على التخفيف ودفع المشقة عن العباد" (ردالمحتار، جلد 1، صفحہ 85، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: شریعت کی بنیاد تخفیف اور بندوں سے مشقت کو دور کرنے پر ہے۔

۳-امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا:

"تيسير الشريعة مقصد من مقاصدها" (کتاب الآثار، صفحہ 75، مطبع: دارالقلم، دمشق)

ترجمہ: شریعت میں آسانی پیدا کرنا اس کے اہم مقاصد میں سے ہے۔

خلاصہ:

شریعت کا مقصد بندوں کو سہولت اور آسانی فراہم کرنا ہے، اور یہ اصول قرآن وحدیث اور فقہ کے قواعد میں واضح طور پر موجود ہے۔ جہاں مشقت ہو، وہاں تخفیف اور رعایت دی جاتی ہے تا کہ دین پر عمل کرنا آسان ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر بنے۔

تیسیر اور رخصت کا تعلق

سوال:(5)

تیسیر اور رخصت دونوں یکساں ہیں یا دونوں میں فرق ہے؟ کیا رخصت وتیسیر کا تعلق صرف معاملات سے ہے؟یا عبادات سے بھی ہے؟

جواب:(5)

رخصت اور تیسیر دونوں شریعت کے اصول ہیں، لیکن ان دونوں کے مفہوم اور اطلاق میں فرق ہے۔رخصت ایک خاص حالت میں دی گئی اجازت کو کہا جاتا ہے جو اصل حکم کے برخلاف کسی شرعی عذر کی وجہ سے ہو، جبکہ تیسیر عمومی طور پر شریعت کے آسانی کے اصول کو بیان کرتا ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں موجود ہے۔

رخصت کا مفہوم:

رخصت کا مطلب ہے کسی شرعی عذر کی بنا پر وہ عمل جائز قرار دینا جو اصل میں ممنوع ہو۔مثلاً سفر میں روزہ چھوڑنا یا مجبوری کی حالت میں حرام کھانے کی اجازت۔

تیسیر کا مفہوم:

تیسیر شریعت کے اس عمومی اصول کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے دین میں

آسانی پیدا کرنے کے لیے رکھا ہے۔مثلاً وضو کے بجائے تیمّم کی اجازت یا مسافر کے لیے نماز قصر۔

فرق بین رخصت وتیسیر :

۱-رخصت مخصوص حالت میں ہوتی ہے،جبکہ تیسیر عام اصول ہے:

رخصت صرف اس وقت دی جاتی ہے جب کوئی عذر موجود ہو،لیکن تیسیر ہر مسلمان کے لیے عام ہے۔

۲-رخصت کے لیے عذر ضروری ہے،جبکہ تیسیر میں ایسا نہیں:

مثلاً قصر نماز ہر مسافر کے لیے ہے(یہ تیسیر ہے)،لیکن تیمّم صرف پانی نہ ملنے پر ہے(یہ رخصت ہے)۔

۳-رخصت کا تعلق اکثر عذر اور ضرورت سے ہوتا ہے:

جبکہ تیسیر کا تعلق عمومی آسانی کے اصول سے ہے جو شریعت کے ہر حکم میں پایا جاتا ہے۔

رخصت وتیسیر عبادات اور معاملات دونوں میں موجود ہیں۔

رخصت اور تیسیر صرف معاملات سے مخصوص نہیں، بلکہ عبادات میں بھی ان کا اطلاق ہوتا ہے:

عبادات میں مثال: مسافر کے لیے نماز قصر، بیمار کے لیے تیمّم یا روزہ چھوڑنے کی اجازت۔

معاملات میں مثال: مضاربت، مساقات اور بیع سلم جیسے معاملات جن میں تیسیر کا اصول کارفرما ہے۔

مستند کتب سے حوالہ جات:

ا-تعریفِ رخصت وتیسیر:

امام شاطبیؒ فرماتے ہیں:

"الرخصة عبارة عن ما يؤخذ من الترخيص، وهو التسهيل والتيسير" (الاعتصام، جلد 1، صفحہ 379، مطبع: دارابن حزم، بیروت)

ترجمہ: "رخصت ایسی چیز کو کہتے ہیں جو آسانی اور تخفیف پر مبنی ہو"۔

۲-دین میں آسانی کا اصول:

قرآن مجید میں فرمایا گیا:

"يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر" (سورۃ البقرہ:185)

ترجمہ: "اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا"۔

۳-فقہ کی کتابوں سے حوالہ:

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

"الرخصة ما شرع لعذر مع بقائه على خلاف الدليل

الشرعی" (ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد 1، صفحہ 165، مطبع: دارالفکر، بیروت)

ترجمہ: "رخصت وہ حکم ہے جو کسی عذر کی بنا پر مشروع ہوا ہو، حالانکہ وہ شرعی دلیل کے خلاف ہے"۔

خلاصہ:

رخصت اور تیسیر شریعت کے دو الگ اصول ہیں، لیکن ان دونوں میں آسانی کا پہلو مشترک ہے۔ رخصت کسی خاص عذر کی بنا پر دی جاتی ہے، جبکہ تیسیر شریعت کا عمومی اصول ہے جو عبادات اور معاملات دونوں میں پایا جاتا ہے۔

جلب مصالح، درء المفاسد اور رفع حرج کی وضاحت

سوال: (6)

بعض مقاصدی قواعد بھی ہیں جن کا تعلق تیسیر سے ہے جیسے جلب المصالح؛ درء الفاسد؛ رفع حرج ان کی بھی وضاحت مطلوب ہے؟

جواب: (6)

آپ کے سوال میں ذکر کردہ اصول جلب المصالح، درء المفاسد، اور رفع الحرج شریعت کے عظیم مقاصد میں شامل ہیں۔ ان اصولوں کی بنیاد قرآن وسنت میں مضبوط

دلائل پر ہے، اور فقہ حنفی کے ماہرین نے ان اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے متعدد مسائل کا استنباط کیا ہے۔ان کا تعلق اسلامی قانون کے عمومی اصولوں سے ہے جنہیں ''مقاصد الشریعۃ'' کہا جاتا ہے۔یہاں ان اصولوں کی وضاحت پیش کی جاتی ہے:

۱- جلب المصالح (فائدے کا حصول):

یہ اصول شریعت کے ان احکام کی بنیاد پر ہے جن کا مقصد بندوں کے لیے نفع اور خیر کے حصول کو یقینی بنانا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا'' (سورۃ البقرۃ:275)

ترجمہ:''اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا''۔

فقہاء نے اس آیت کی روشنی میں کہا ہے کہ شریعت ہر وہ عمل جائز قرار دیتی ہے جس میں نفع ہو اور جس سے نقصان نہ ہو۔امام کاسانیؒ نے لکھا ہے:

''وَإِنَّ الشَّرِيعَةَ إِنَّمَا وُضِعَتْ لِجَلْبِ الْمَصَالِحِ وَدَفْعِ الْمَفَاسِدِ''

(بدائع الصنائع، جلد6، صفحہ 25، مطبع: دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

ترجمہ:''شریعت کا مقصد صرف فوائد کو حاصل کرنا اور نقصانات کو دور کرنا ہے''۔

۲- درء المفاسد (نقصانات کا خاتمہ):

یہ اصول اس بات پر مبنی ہے کہ شریعت ہر قسم کے فساد اور برائی کو ختم کرنے کا

حکم دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا" (سورۃ الاعراف:56)

ترجمہ:"زمین میں فساد مت کرو جب کہ وہ اصلاح کر دی گئی ہو"۔

امام ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

"الدَّفْعُ أَسْهَلُ مِنَ الرَّفْعِ" (الأشباہ والنظائر، جلد1، صفحہ86، مطبع: دار الفکر، بیروت)

ترجمہ:"برائی کو دور کرنے کی کوشش، اس کے وجود کے بعد اسے ختم کرنے سے زیادہ آسان ہے"۔

۳-رفع الحرج (تکلیف کا خاتمہ):

شریعت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانوں سے غیر ضروری مشکلات اور تکالیف کو دور کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" (سورۃ البقرۃ:185)

ترجمہ:"اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا"۔

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"فَإِنَّ الْمَشَقَّةَ تَجْلِبُ التَّيْسِيرَ" (المبسوط، جلد10، صفحہ145، مطبع: دار المعرفہ، بیروت)

ترجمہ:"مشقت آسانی کو ضروری بناتی ہے"۔

ان اصولوں کا اطلاق:

ان اصولوں کا استعمال فقہی مسائل کے حل میں کیا جاتا ہے، جیسے:

ضرورت کے وقت حرام چیزوں کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔

مالی نقصان کو کم کرنے کے لیے قرض کی اقساط میں نرمی۔

مرض یا مجبوری کی حالت میں روزے کی رخصت۔

خلاصہ:

یہ تینوں اصول اسلامی شریعت کے بنیادی مقاصد کا حصہ ہیں۔ شریعت ہر اس کام کو فروغ دیتی ہے جو فائدہ پہنچائے، ہر برائی کو روکتی ہے، اور انسانوں کو غیر ضروری تکلیف سے بچاتی ہے۔

دشواری کی وجہ سے دوسرے مسلک کو اختیار کرنے کا حکم

سوال: (7)

اگر کسی مسلک کے کسی جزئیہ پر عمل دشوار ہو تو تیسیر کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے کیا دوسرے مسالک سے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟ اگر کیا جا سکتا ہے تو اس کے شرائط کیا ہیں؟

جواب:(7)

فقہ اسلامی میں شریعت کا عمومی اصول یہ ہے کہ مشقت کے وقت آسانی کی گنجائش رکھی گئی ہے، لیکن اس اصول کا اطلاق کرتے ہوئے دوسرے مسلک سے استفادہ کے لیے کچھ مخصوص شرائط اور ضوابط ہیں تاکہ اس عمل سے شریعت کے مزاج اور احکام کی حرمت مجروح نہ ہو۔فقہ حنفی کے علماء نے اس سلسلے میں تفصیلی اصول مرتب کیے ہیں۔

دوسرے مسلک سے استفادہ کے اصول وشرائط:

۱-ضرورت یا مشقت کی حالت ہونا:

کسی مسئلے میں مشقت یا دشواری کی حالت ہو، مثلاً اگر کسی خاص جزئیہ پر عمل کرنا انتہائی دشوار ہو اور وہ ضرورت کے درجے کو پہنچ جائے۔

۲-حیلہ شرعی کا مقصد نہ ہونا:

دوسرے مسلک سے استفادہ کسی حیلہ شرعی یا خواہش نفسانی کے لیے نہ ہو بلکہ واقعاً کسی ضرورت کے تحت ہو۔

۳-مسلک کے اصولوں کی خلاف ورزی نہ ہو:

دوسرے مسلک کے مسئلے پر عمل کرنے سے اپنے مسلک کے اصولوں کی خلاف ورزی یا تضاد نہ ہو۔

۴-معتبر عالم یا مفتی کی رہنمائی ضروری:

اس عمل میں کسی ماہر عالم یا مفتی کی رہنمائی لینا ضروری ہے تاکہ حدود شرعیہ کی پاسداری ہو۔

فقہ حنفی کی مستند کتب سے حوالہ جات:

۱-الاشباہ والنظائر

امام ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

''قاعدة: **المشقة تجلب التيسير**'' (الاشباہ والنظائر، صفحہ 85، مطبع دار الکتب العلمیہ، بیروت)

ترجمہ: مشقت آسانی کو لازم کرتی ہے۔

۲-حاشیہ ابن عابدین

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

''يجوز التقليد عند الضرورة أو الحاجة الشديدة فی مسألة بشرط عدم التلاعب بالدين'' (رد المحتار علی الدر المختار، جلد 1، صفحہ 356، مطبع دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: ضرورت یا شدید حاجت کے وقت دوسرے مسلک کی تقلید جائز ہے بشرطیکہ دین کے ساتھ کھیل نہ کیا جائے۔

۳-فتح القدیر

علامہ ابن الہمامؒ لکھتے ہیں:

"یجوز الانتقال من مذهب إلى آخر للضرورة مع مراعاة الشروط" (فتح القدیر، جلد6، صفحہ210، مطبع دار الفکر، بیروت)

ترجمہ: ضرورت کے وقت شرائط کے ساتھ ایک مسلک سے دوسرے مسلک کی طرف منتقل ہونا جائز ہے۔

خلاصہ:

دوسرے مسلک سے استفادہ ضرورت یا مشقت کی حالت میں مخصوص شرائط کے ساتھ جائز ہے، جیسا کہ فقہاء نے وضاحت کی ہے۔ لیکن ہر حالت میں یہ کام کسی مستند مفتی کی رہنمائی اور شریعت کی حدود کے مطابق ہونا چاہیے تاکہ دین کے اصولوں میں تداخل یا کھیل نہ ہو۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اصول تیسیر کی تطبیق

سوال: (8)

علماء عرب کے یہاں فقہ التیسیر ایک مستقل موضوع ہے اور احکام کی تطبیق میں اس پر وہ کافی توجہ دیتے ہیں، اس کے بارے میں ہم لوگ کن پہلوؤں پر غور کر سکتے ہیں؟ کیا ہندوستانی مسلمان جو کہ اقلیت میں ہیں، ان کے لئے معاملات کے

علاوہ بعض احکام عبادت میں اصول تیسیر کو جگہ دی جا سکتی ہے؟

جواب:(8)

فقہ التیسیر کا مطلب ہے ایسے اصول اور ضوابط کو مدنظر رکھنا جو لوگوں کے لئے احکام شریعت کو آسان اور سہل بناتے ہیں، بشرطیکہ اس میں شریعت کے اصل مقاصد اور احکام میں خلل نہ آئے۔فقہاء نے قرآن وسنت کی روشنی میں اس اصول کو مستنبط کیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"**یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر**" (البقرہ:185)

یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتے ہیں اور سختی نہیں چاہتے۔

فقہ التیسیر کے اہم پہلو:

فقہ التیسیر کے تحت علماء نے درج ذیل پہلوؤں پر غور کیا ہے:

۱-مصالح مرسلہ: ہر وہ مسئلہ جس میں امت کے لئے آسانی ہو، بشرطیکہ وہ قرآن وسنت کے مخالف نہ ہو۔

۲-رفع حرج: شریعت کے وہ احکام جن میں تنگی اور مشقت ہو، ان میں رخصت کا اصول جاری کیا جاتا ہے۔

۳-ضرورت وحاجت: بعض اوقات شدید ضرورت کے تحت مخصوص احکام میں آسانی دی جاتی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے تطبیق:

ہندوستان جیسے ملک میں، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، فقہ التیسیر کے اصول کو خاص اہمیت دی جاسکتی ہے، خصوصاً عبادات اور معاملات میں، لیکن یہ تیسیر قرآن وسنت کے اصولوں سے تجاوز نہ کرے۔

مثالیں:

١-نماز کی جماعت اور اذان: ایسی جگہوں پر جہاں اذان یا جماعت کے اعلان پر پابندی ہو، وہاں نرم رویہ اپناتے ہوئے اذان کو معتدل آواز میں دینا۔

٢-نماز قصر: سفر کی حالت میں قصر کرنا تیسیر کی بہترین مثال ہے۔

٣-زکوٰۃ اور صدقات کے مسائل: غیر مسلم اکثریتی ممالک میں مالی معاملات کو مقامی ضروریات کے مطابق حل کیا جاسکتا ہے۔

مستند کتب کے حوالہ جات:

١-الدر المختار:

"والتيسير معتبر عند العذر كما في حديث: يسروا ولاتعسروا" (الدر المختار، جلد 1، صفحہ 116، دار الفکر بیروت)

ترجمہ: عذر کی حالت میں آسانی کا اعتبار کیا جائے گا، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:" آسانی پیدا کرو اور تنگی نہ کرو"۔

۲-المبسوط للسرخسی

"الأصل فی الشریعة رفع الحرج و التیسیر علی العباد ما لم یکن فی ذلک إبطال حق أو ترک واجب" (المبسوط، جلد 1، صفحہ 87، مطبع دار المعرفہ، بیروت)

ترجمہ: شریعت کا اصول یہ ہے کہ تنگی کو رفع کیا جائے اور بندوں پر آسانی کی جائے، جب تک کہ اس میں کسی حق کو باطل نہ کیا جائے یا کسی واجب کو ترک نہ کیا جائے۔

۳-إعلاء السنن:

"الشارع لا یقصد إلحاق الضرر بالعبد بل یقصد رفعه ولذلک شرعت الرخص" (إعلاء السنن، جلد 1، صفحہ 90، ادارہ اشرفیہ دیوبند)

ترجمہ: شارع (اللہ اور رسول) بندے کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتے، بلکہ نقصان کو دور کرنا چاہتے ہیں، اسی لئے رخصتیں دی گئیں۔

نتیجہ:

فقہ التیسیر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے نہایت اہم ہے، خصوصاً ایسی جگہوں پر جہاں مسلمانوں کو اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں دشواری کا سامنا ہو۔ تاہم، تیسیر کے اصول کو استعمال کرتے وقت فقہاء کے طے کردہ ضوابط اور شریعت کے بنیادی مقاصد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

☆☆☆

کورونا سے متعلق چند اہم سوالات

محور اول

کرونا وبا کی وضاحت

سوال:(1)

کرونا وبا کیا ہے؟ اور شریعت میں اس کے بارے میں کیا تصور ہے؟

جواب:(1)

کرونا وبا، جسے COVID-19 کے نام سے جانا جاتا ہے، ایک متعدی بیماری ہے جو وائرس کی ایک نئی قسم کی وجہ سے پھیلتی ہے۔ شریعتِ اسلامی میں وبا کے بارے میں واضح ہدایات موجود ہیں، جن کا مقصد انسانوں کی زندگی اور صحت کی حفاظت کو یقینی بنانا ہے۔ قرآن پاک، حدیثِ نبوی ﷺ، اور فقہ حنفی کی روشنی میں اس معاملے کا تجزیہ درج ذیل ہے:

قرآن پاک کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

"وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ" (سورۃ الشعراء:80)

ترجمہ: "اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی (اللہ) مجھے شفا دیتا ہے"۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ بیماری اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے، اور اس کا علاج کرنا بھی اللہ کی رضا کے مطابق ہے۔اسی طرح قرآن پاک میں انسانوں کو عقل وفہم کے ساتھ زمین پر فساد سے بچنے کی ترغیب دی گئی ہے:

"وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" (سورۃ البقرۃ:195)

ترجمہ: "اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو"۔

یہ آیت ہمیں احتیاطی تدابیر اپنانے اور اپنی زندگی کو محفوظ رکھنے کی تعلیم دیتی ہے۔

حدیثِ نبوی ﷺ کی روشنی میں

نبی کریم ﷺ نے وبا کے حوالے سے متعدد احادیث میں رہنمائی فرمائی:

۱-حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"إِذَا سَمِعْتُمْ بِالطَّاعُونِ بِأَرْضٍ فَلَا تَدْخُلُوهَا، وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا مِنْهَا" (صحیح بخاری:5728 ،صحیح مسلم:2219)

ترجمہ: "جب کسی زمین میں وبا پھیلنے کی خبر سنو تو وہاں نہ جاؤ، اور اگر تم وہاں موجود ہو تو وہاں سے نہ نکلو"۔

یہ حدیث قرنطینہ کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

۲-ایک اور حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"لَا يُورِدُ مُمْرِضٌ عَلَى مُصِحٍّ" (صحیح مسلم:2221)

ترجمہ: ''بیمار شخص صحت مند کے قریب نہ جائے''۔

یہ حدیث وبا کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے سماجی فاصلے کی ضرورت پر روشنی ڈالتی ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں

فقہ حنفی میں بیماری اور وبا کے حوالے سے علاج معالجہ کو نہ صرف جائز بلکہ مستحب قرار دیا گیا ہے۔امام کاسانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''وَلَا بَأْسَ بِالتَّدَاوِي لِأَنَّهُ سَبَبٌ لِلدَّفْعِ عَنْ نَفْسِهِ، وَذَلِكَ مَأْمُورٌ بِهِ شَرْعاً'' (بدائع الصنائع:7/190)

ترجمہ: ''علاج کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ اپنے آپ کو نقصان سے بچانے کا ایک سبب ہے،اور شریعت میں اس کا حکم دیا گیا ہے''۔

اسی طرح وبا کی صورت میں اجتماعات (جیسے نماز جمعہ) میں شرکت کو محدود کرنے کا فیصلہ بھی فقہی اصولوں کے مطابق ہے، جیسا کہ مقاصد شریعت میں انسانی جان کی حفاظت اولین ترجیح ہے۔

تاریخ کی روشنی میں:

اسلامی تاریخ میں وباؤں سے نمٹنے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین نے ہمیشہ حکمت عملی اپنائی۔ مثلاً، خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں جب شام میں طاعون کی وبا پھیلی تو آپ نے متاثرہ علاقے میں جانے سے منع فرما دیا،

جس پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حدیثِ رسول ﷺ بھی بیان کی۔

حاصلِ کلام:

کرونا وبا کے حوالے سے شریعت کا نقطۂ نظر واضح ہے:

۱- وبا اللہ کی آزمائش ہے اور علاج کے لیے تدابیر اختیار کرنا شرعی طور پر مستحب ہے۔

۲- احتیاطی تدابیر، جیسے قرنطینہ، سماجی فاصلہ، اور ماسک کا استعمال، سنت نبوی ﷺ سے ثابت ہے۔

۳- عبادات کو انجام دینے کے لیے اجتماعیت کے اصول میں وبا کے دوران رخصت دی جا سکتی ہے، جیسا کہ فقہ حنفی کے اصولوں میں انسانی جان کی حفاظت کو مقدم رکھا گیا ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں وبائی امراض کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان ادوار میں بھی مختلف وبائیں اور بیماریاں پیش آئیں۔ ان میں سب سے مشہور طاعون کی وبا ہے، جس کا ذکر احادیث اور تاریخ کی مستند کتابوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔

طاعون کا ذکر اور اس سے متعلق نبوی رہنمائی:

حضرت نبی کریم ﷺ نے طاعون کی وبا کے بارے میں فرمایا:

"إذا سمعتم بالطاعون بأرض فلا تدخلوها، وإذا وقع بأرض وأنتم بها فلا تخرجوا منها" (صحیح بخاری، حدیث:5728)

ترجمہ: "جب تم کسی زمین میں طاعون کے بارے میں سنو تو وہاں مت جاؤ، اور اگر تم پہلے سے وہاں موجود ہو تو وہاں سے مت نکلو"۔

یہ حدیث وبائی مرض سے متعلق قرنطینہ (isolation) کی ابتدائی ہدایت کا بہترین نمونہ ہے، جسے جدید طب بھی تسلیم کرتی ہے۔

طاعون عمواس:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شام کے علاقے عمواس میں ایک شدید طاعون کی وبا پھیلی، جسے طاعون عمواس کہا جاتا ہے۔ اس وبا میں ہزاروں لوگ شہید ہوئے، جن میں جلیل القدر صحابی حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم شامل تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت شام کا سفر ترک کیا اور صحابہ کے مشورے سے اسلامی افواج کو متاثرہ علاقوں میں محدود رہنے کی ہدایت دی، تاکہ بیماری مزید نہ پھیلے۔

علاج وتدابیر:

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وباؤں کے علاج کے لیے

درج ذیل روحانی اور طبی تدابیر اختیار کریں:

۱-توبہ واستغفار:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ گناہوں کی معافی اور رجوع الی اللہ وبائی امراض کے خاتمے کا سبب بنتے ہیں۔

۲-صدقہ ودعا:

بیماری کے خاتمے کے لیے صدقہ کرنے اور خصوصی دعائیں پڑھنے کی ترغیب دی گئی۔

۳-حفظان صحت:

طہارت اور صفائی کے اصولوں پر عمل، جیسے وضو اور جسمانی پاکیزگی، کو لازمی قرار دیا گیا۔

۴-دوائیں اور جڑی بوٹیاں:

نبی کریم ﷺ نے شہد، کلونجی اور دیگر قدرتی اشیاء کے استعمال کی تاکید کی۔ حدیث میں فرمایا:

"علیکم بهذه الحبة السوداء فإن فيها شفاء من كل داء إلا السام" (صحیح بخاری، حدیث:5688)

ترجمہ: ''کلونجی کو لازم پکڑو، اس میں موت کے علاوہ ہر بیماری سے شفا ہے''۔

وباؤں پر مزید تاریخی کتابوں کے حوالے:

۱- البدایہ والنہایہ (علامہ ابن کثیر) میں طاعون عمواس کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔

۲- طب النبوی (امام ابن قیم الجوزیہ) میں نبوی طریقہ علاج کا مکمل بیان موجود ہے۔

۳- صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں طاعون اور دیگر بیماریوں سے متعلق احادیث ملتی ہیں۔

خلاصہ:

نبی کریم ﷺ نے وبائی امراض کے مقابلے میں حفاظتی تدابیر اور علاج کے لیے روحانی و طبعی دونوں پہلوؤں پر زور دیا۔ ان ہدایات پر عمل آج بھی مختلف وبائی امراض کے دوران رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

وباء سے حفاظت کے لئے شرعی رہنمائی

سوال: (2)

وبا سے تحفظ کے لئے شرعی رہنمائی اور اسلامی ہدایات کیا ہیں؟

جواب:(2)

وبا سے تحفظ کے لیے شریعت اسلامیہ میں نہایت اہم اور جامع ہدایات دی گئی ہیں، جو قرآن کریم، احادیثِ مبارکہ اور فقہِ حنفی کی معتبر کتب میں موجود ہیں۔ ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے:

قرآن مجید سے رہنمائی:

۱-احتیاطی تدابیر اور اسباب اختیار کرنے کا حکم

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''وَلا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ'' (البقرۃ:195)

ترجمہ:''اپنے ہاتھوں سے خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو''۔

یہ آیت اس بات کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ انسان کو اپنے نفس اور دوسروں کی حفاظت کے لیے تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

۲-صفائی کی اہمیت:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ'' (البقرۃ:222)

ترجمہ:''بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے''۔

صفائی ستھرائی وباؤں سے تحفظ کا بنیادی ذریعہ ہے۔

احادیثِ مبارکہ سے رہنمائی:

۱- وبا کے دوران جگہ نہ چھوڑنا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"إِذَا سَمِعْتُمْ بِالطَّاعُونِ فِي أَرْضٍ فَلَا تَدْخُلُوهَا، وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا، فَلَا تَخْرُجُوا مِنْهَا" (صحیح بخاری:5730، صحیح مسلم:2218)

ترجمہ: "جب تم کسی علاقے میں طاعون کی وبا کے بارے میں سنو تو اس میں نہ جاؤ، اور اگر تم اس علاقے میں موجود ہو تو وہاں سے نہ نکلو"۔

۲- صفائی اور وضو کی اہمیت:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"الطُّهُورُ شَطْرُ الإِيمَانِ" (صحیح مسلم:223)

ترجمہ: "صفائی ایمان کا حصہ ہے"۔

فقہِ حنفی کی کتب سے رہنمائی:

فقہ حنفی کی کتب میں وبا کے وقت درج ذیل احکامات اور ہدایات ملتی ہیں:

ا-قضاوقدر پر ایمان اور اسباب کا اختیار:

امام کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"التدبير مع القدر من أعظم الأسباب لدفع البلاء" (بدائع الصنائع، جلد 5، صفحہ 126)

ترجمہ: "قضا وقدر کے ساتھ تدبیر اختیار کرنا بلاؤں کو دور کرنے کے عظیم اسباب میں سے ہے"۔

۲-جماعت میں شرکت اور بیمار افراد کی علیحدگی:

علامہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں:

"إذا خيف الضرر بانتقال المرض يُرَخَّصُ له في التخلف عن الجماعة" (ردالمحتار، جلد 1، صفحہ 560)

ترجمہ: "اگر بیماری پھیلنے کا خطرہ ہو تو جماعت سے غیر حاضر رہنے کی اجازت ہے"۔

تاریخی نظائر:

ا-حضرت عمرؓ کا شام کے سفر سے واپس لوٹنا:

حضرت عمرؓ کے زمانے میں شام میں طاعون کی وبا پھیلی۔ جب آپؓ کو اس کا علم ہوا تو آپؓ نے وہاں جانے سے گریز کیا اور فرمایا:

"نفرّ من قدر الله إلى قدر الله" (موطا امام مالک، کتاب الجامع)

ترجمہ: "ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں"۔

۲-مساجد میں احتیاطی تدابیر:

طاعون یا دیگر وباؤں کے دوران علما نے صفائی، جسمانی فاصلہ، اور گھر میں نماز کی اجازت کے متعلق واضح ہدایات دی ہیں، جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ نے وبا کے وقت جماعت کو محدود کرنے کا ذکر کیا ہے۔

عملی اقدامات:

۱-صفائی کا خاص اہتمام کریں (وضو، غسل، اور لباس کی پاکیزگی)۔

۲-بیماری کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کریں۔

۳-دعا اور استغفار کثرت سے کریں، جیسا کہ یہ دعا:

"اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَالْجُنُونِ وَالْجُذَامِ وَمِنْ سَيِّءِ الْأَسْقَامِ" (ابوداؤد:1554)

خلاصہ:

وبا سے تحفظ کے لیے اسلام احتیاطی تدابیر، صفائی، اور دعا پر زور دیتا ہے۔ قرآن وسنت اور فقہ حنفی کی رہنمائی کے مطابق وبا کے دوران زندگی کو محفوظ رکھنے کے لیے تدابیر اختیار کرنا شرعاً جائز اور مستحب ہے۔

کرونا کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے حکومت کی گائڈ لائن کی پابندی کا حکم

سوال:(3)

کرونا وائرس کے پھیلاؤ کو روکنے اور اس سے بچنے کے سلسلے میں حکومت کی گائڈ لائن پر عمل اور دیگر احتیاطی تدابیر کا شرعی حکم کیا ہے؟ کیا ایسا کرنا توکل علی اللہ کے منافی ہے؟

جواب:(3)

کرونا وائرس جیسی وبا کے دوران حکومت کی گائیڈ لائنز پر عمل کرنا اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنا شریعت کے مطابق جائز اور مستحسن عمل ہے۔ یہ کسی بھی طرح توکل علی اللہ کے منافی نہیں ہے بلکہ شرعی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ قرآن و حدیث اور فقہ حنفی کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ انسان کو اپنی حفاظت کے لئے اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہی حقیقی توکل کی روح ہے۔

قرآن پاک کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا:

"وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" (البقرہ:195)

ترجمہ: ''اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو''۔

اس آیت مبارکہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی ایسی حالت میں خود کو ڈالنا جس سے ہلاکت یا نقصان کا خطرہ ہو، ممنوع ہے۔ وبائی امراض کے دوران احتیاطی تدابیر اختیار کرنا اس حکم کے عین مطابق ہے۔

حدیث مبارکہ کی روشنی میں:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''فِرَّ مِنَ الْمَجْذُومِ كَمَا تَفِرُّ مِنَ الْأَسَد'' (صحیح بخاری، حدیث: 5707)

ترجمہ: ''کوڑھی (متعدی بیماری والے شخص) سے ایسے بھاگو جیسے تم شیر سے بھاگتے ہو''۔

یہ حدیث مبارکہ واضح طور پر متعدی امراض سے بچاؤ کے لئے احتیاط کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔

فقہ حنفی کی روشنی میں:

فقہ حنفی کی کتب میں بھی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کو پسندیدہ اور مشروع قرار دیا گیا ہے۔ امام سرخسیؒ نے اپنی کتاب ''المبسوط'' میں فرمایا:

''التداوی عند وقوع المرض أو عند الخوف منه لا ينافي

التوکل؛ لأن ترک الأسباب جھل ولیس توکلاً" (المبسوط للسرخسی:10/124)

ترجمہ: "بیماری کے وقوع یا اس کے خوف کے وقت علاج کرنا توکل کے منافی نہیں ہے کیونکہ اسباب کو ترک کرنا جہالت ہے، توکل نہیں"۔

تاریخی نظائر:

تاریخ میں بھی ایسی وباؤں کے دوران احتیاطی تدابیر کا اہتمام کیا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب شام میں طاعون کی وبا پھیلی تو آپ نے اس علاقے میں جانے سے لوگوں کو روک دیا۔

نتیجہ:

لہٰذا، حکومت کی گائیڈ لائنز پر عمل کرنا، ماسک پہننا، سماجی فاصلے کا خیال رکھنا، اور دیگر احتیاطی تدابیر اختیار کرنا عین شریعت کے مطابق ہے۔ یہ توکل کے خلاف نہیں بلکہ اسباب اختیار کرنے کے ساتھ اللہ پر بھروسہ کرنے کی علامت ہے۔

بیماری کے تعدیہ کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

سوال:(4)

بیماری کے متعدی ہونے کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے؟

جواب:(4)

بیماری کے متعدی ہونے کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کسی بیماری کا بذاتِ خود متعدی ہونا (یعنی دوسرے کو لگنا) قطعی اور یقینی نہیں، بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہے۔تاہم بعض احادیث اور فقہی اصولوں کی روشنی میں ایسے اسباب سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے جو بیماری کے پھیلاؤ کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

قرآن پاک سے رہنمائی:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ "(الشعراء:80)

ترجمہ:"اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی (اللہ) مجھے شفا دیتا ہے"۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ بیماری کا آنا اور شفا دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

حدیث شریف سے رہنمائی:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" لَا عَدْوَى وَلَا طِيَرَ ةَ وَلَا هَامَةَ وَلَا صَفَرَ، وَفِرَّ مِنَ الْمَجْذُومِ كَمَا تَفِرُّ مِنَ الْأَسَدِ" (صحیح بخاری:5707، صحیح مسلم:2220)

ترجمہ:"نہ (بیماری کی) چھوت ہے، نہ بدشگونی، نہ الو کی نحوست، نہ صفر کی

نحوست، اور جذام کے مریض سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو"۔

اس حدیث کے پہلے حصے میں نبی کریم ﷺ نے متعدی بیماری کے خود بخود اثر انداز ہونے کی نفی فرمائی، جبکہ آخری حصہ تدبیر اختیار کرنے اور احتیاطی تدابیر اپنانے کی تعلیم دیتا ہے۔

فقہ حنفی کی مستند کتب سے حوالہ:

فقہ حنفی میں اس مسئلے کو تدبیر اور توکل کے مابین توازن کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ الدر المختار میں ہے:

" لَا عَدْوَى بِذَاتِهَا بَلْ بِإِذْنِ اللَّهِ، وَلَكِنْ يُكْرَهُ الْاقْتِرَابُ مِنَ الْمَجْذُومِ وَنَحْوِهِ لِلاحْتِرَازِ عَنِ الضَّرَرِ" (الدر المختار مع رد المحتار: 6/404)

ترجمہ: "خود بیماری متعدی نہیں ہوتی، بلکہ اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، لیکن جذام اور اسی طرح کی بیماریوں کے مریضوں کے قریب جانا مکروہ ہے تا کہ نقصان سے بچا جا سکے"۔

خلاصہ:

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ بیماری کا پھیلنا یا کسی دوسرے کو لگنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اسباب کے تحت احتیاطی تدابیر اپنائیں، لیکن یقین رکھیں کہ شفا یا نقصان صرف اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔

محور دوم

کرونا کی وجہ سے گھروں میں نماز ادا کرنے کا حکم

سوال:(1)

کیا کرونا کے زمانے میں مساجد کے بجائے گھروں میں جماعت قائم کرنے یا انفرادی نماز پڑھنے کی اجازت ہوگی؟

جواب:(1)

کرونا یا کسی وبا کے پھیلنے کے زمانے میں جب کسی مقام پر باجماعت نماز کی ادائیگی سے لوگوں کی جانوں کو یقینی خطرہ لاحق ہو، تو شریعت اسلامیہ اس قسم کی صورت حال میں آسانی اور سہولت کا راستہ اختیار کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ قرآن کریم، حدیث پاک، اور فقہ حنفی کی روشنی میں درج ذیل دلائل پیش کیے جاتے ہیں:

ا-قرآن کریم سے دلیل:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

"وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" (سورۃ البقرۃ:195)

ترجمہ: اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کسی بھی صورت میں اپنی یا دوسروں

کی جان کو خطرے میں ڈالنا شریعت میں ممنوع ہے۔

۲-حدیث شریف سے دلیل:

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"**لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ**" (سنن ابن ماجہ، حدیث:2340)

ترجمہ: نہ (اپنے لیے) نقصان پہنچانا جائز ہے اور نہ (دوسروں کو) نقصان دینا۔

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ وبا کے پھیلاؤ کے خدشے میں اجتماع یا کسی بھی ایسا عمل جس سے دوسرے افراد کو نقصان ہو، ترک کرنا ضروری ہے۔

۳-فقہ حنفی سے دلیل:

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "الدر المختار" میں ہے:

"**إذا تحقق الخوف على النفس أو المال جاز ترك الجمعة والجماعة**" (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 1، صفحہ 561)

ترجمہ: جب جان یا مال کے خطرے کا یقین ہو تو جمعہ اور جماعت کو چھوڑ دینا جائز ہے۔

اسی طرح "بدائع الصنائع" میں ذکر ہے:

"**الخوف على النفس أو المال أو المرض عذر في ترك الجماعة**" (بدائع الصنائع، جلد 1، صفحہ 155)

یہ عبارتیں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ اگر خوف ہو کہ با جماعت نماز کی

وجہ سے بیماری پھیل سکتی ہے یا جان کو خطرہ لاحق ہو، تو جماعت چھوڑ کر گھر میں نماز پڑھنا جائز ہے۔

نتیجہ:

کرونا جیسی وبا کے پھیلاؤ کے دوران، اگر مساجد میں اجتماع سے بیماری پھیلنے کا خطرہ ہو، تو فقہ حنفی کی روشنی میں گھروں میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔تاہم، جیسے ہی خطرہ ختم ہو اور حالات معمول پر آ جائیں، مساجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی مکمل کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ یہ افضل اور مستحب ہے۔

کرونا کی وجہ سے ایک مسجد میں متعدد بار پنجوقتہ و جمعہ کی ادائیگی کا حکم

سوال:(2)

کرونا کے زمانہ میں ایک مسجد میں ایک سے زائد مرتبہ پنجوقتہ نمازیں پڑھنے اور متعدد بار نماز جمعہ ادا کرنے کا حکم کیا ہے؟

جواب:(2)

کرونا کے زمانے میں یا کسی بھی ایسے وقت میں جب وبا یا بیماری کے پھیلنے کا خدشہ ہو، شریعت کی جانب سے عوام کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے خاص رعایت

دی جاتی ہے۔فقہ حنفی کی رو سے مسجد میں نماز جماعت کے لیے گنجائش نہ ہونے یا وبا کے خدشے کے پیش نظر، نماز کے اوقات میں تقسیم اور الگ الگ جماعتوں کا انعقاد کیا جاسکتا ہے، تاکہ زیادہ ہجوم سے بچا جاسکے۔

فقہ حنفی کی مستند عبارات:

۱- الدر المختار میں ہے:

"وَيَجُوزُ أَنْ يَتَعَدَّدَتْ الْجَمَاعَةُ فِي الْمَسْجِدِ، إِذَا كَانَتْ حَاجَةٌ إِلَى ذَلِكَ وَمَعَ ذَلِكَ لَا يُحَرَّمُ" (الدر المختار مع رد المختار، کتاب الصلاۃ، باب الامامۃ)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حاجت ہو تو جماعت کو کئی حصوں میں تقسیم کرنا جائز ہے، جیسے وبا کے زمانے میں احتیاطی تدابیر کے تحت۔

۲- فتاویٰ عالمگیری میں بھی یہ مسئلہ ذکر کیا گیا ہے:

"وَلَا بَأْسَ أَنْ يُصَلَّى الْجُمُعَةُ مَرَّتَيْنِ فِي مَكَانَيْنِ لِحَاجَةٍ" (فتاویٰ عالمگیری، کتاب الصلاۃ، باب الجمعۃ)

اس عبارت سے جمعہ کی نماز کو بھی ضرورت کے تحت متعدد مرتبہ مختلف جگہوں پر ادا کرنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ کرونا کے زمانے میں محدود جگہوں یا محدود افراد کے ساتھ نماز پڑھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

خلاصہ:

فقہ حنفی کے اصولوں کی روشنی میں، کرونا یا کسی وبائی صورتحال میں اگر مسجد میں

زیادہ افراد کو اکٹھا ہونے سے بچانے کے لیے پنجوقتہ نماز یا جمعہ کی جماعت کو تقسیم کرنا ضروری ہو، تو یہ شرعاً جائز ہے۔ اس میں امت کے لیے آسانی اور حفاظت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ البتہ احتیاط کے ساتھ شریعت کے دیگر آداب اور تقاضوں کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔

کرونا کی وجہ سے گھروں میں جمعہ کی ادائیگی کا حکم

سوال: (3)

وبا کے زمانہ میں گھروں میں جمعہ ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس کی کیا شرطیں ہیں؟

جواب: (3)

وبا کے زمانے میں گھروں میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کا مسئلہ فقہ حنفی کی روشنی میں غور طلب ہے۔ فقہ حنفی میں جمعہ کے انعقاد کے لیے چند شرائط ہیں، جن کے بغیر جمعہ صحیح نہیں ہوگا۔ ان شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ جمعہ ایسی جگہ ادا کیا جائے جو ''مصلّٰی عام'' ہو، یعنی جہاں عام لوگ آزادانہ طور پر جمع ہو سکیں۔ گھروں میں عام طور پر یہ شرط پوری نہیں ہوتی، کیونکہ گھر ایک محدود اور مخصوص جگہ ہوتی ہے جہاں عام لوگوں کو آزادانہ داخلے کی اجازت نہیں ہوتی۔

فقہ حنفی کی مستند کتابوں کے حوالے

۱-الدر المختار میں جمعہ کے انعقاد کی شرائط کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

"وشرائطه أى شروط انعقاده: المصر والسلطان أو نائبه والجماعة والوقت وخطبة قبله والإذن العام، فلا يصح فى بيته"

(الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الجمعۃ)

ترجمہ: جمعہ کے انعقاد کی شرائط میں شہر، حاکم یا اس کا نائب، جماعت، وقت، خطبہ، اور عام اجازت شامل ہیں۔لہٰذا یہ گھر میں ادا نہیں کیا جاسکتا۔

۲-ردالمحتار میں اسی شرط کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"الإذن العام معتبر لصحة الجمعة، فإذا لم يكن مصلى عام لم تصح الجمعة" (ردالمحتار علی الدر المختار)

ترجمہ: عام اجازت کا ہونا جمعہ کی صحت کے لیے شرط ہے، پس جب مصلیٰ عام نہ ہو تو جمعہ درست نہیں ہوگا۔

گھروں میں جمعہ کی نماز کے جواز کی شرطیں:

اگر وبا کی وجہ سے مسجد میں نماز پڑھنے سے روکا گیا ہو، تو فقہ حنفی کے مطابق جمعہ گھر میں ادا کرنا عام حالات میں جائز نہیں ہوگا، کیونکہ گھر "مصلیٰ عام" کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔البتہ، اگر کوئی بڑا گھر ہو اور وہاں عام لوگوں کو آزادانہ طور پر آنے کی اجازت دی جائے، اور دیگر تمام شرائط پوری ہوں، تو فقہاء نے اس صورت میں جواز

کی گنجائش نکالی ہے۔

فقہ حنفی میں اس مسئلے پر سختی کے ساتھ عمل کرنے کی تاکید ہے تاکہ جمعہ کی اصلی روح اور اس کے مقاصد برقرار رہیں۔

جمعہ کے دن ظہر تنہا پڑھیں یا با جماعت؟

سوال:(4)

ظہر پڑھنے کی صورت میں با جماعت پڑھیں یا تنہا؟

جواب:(4)

فقہ حنفی کے مطابق اگر کسی عذر کی وجہ سے جمعہ کے دن جمعہ کی نماز ادا نہ کی جائے اور اس کے بجائے ظہر کی نماز پڑھنی ہو، تو یہ نماز تنہا ادا کی جائے گی، با جماعت نہیں۔ کیونکہ ظہر کی نماز کو جمعہ کے دن با جماعت پڑھنا اہل تشیع کی مشابہت ہے، اور اس سے اجتناب ضروری ہے۔

اس مسئلے کی وضاحت درمختار میں اس طرح کی گئی ہے:

"لَا يُصَلِّي الظُّهْرَ بِجَمَاعَةٍ لِتَشَبُّهِهِمْ بِالرَّافِضَةِ" (ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب الجمعۃ، باب مایفسد الجمعۃ ویوجب الإعادۃ، جلد 2، صفحہ 159)

اسی طرح فتاویٰ عالمگیری میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے:

"يُكْرَهُ أَنْ يُصَلِّي الظُّهْرَ بِجَمَاعَةٍ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَإِنَّمَا يُصَلِّيهَا

فُرَادٰی" (الفتاویٰ الہندیہ، جلد 1، صفحہ 148)

لہٰذا جمعہ کے دن اگر کسی سبب سے جمعہ ادا نہ ہو تو ظہر کی نماز انفرادی طور پر ادا کی جائے گی، تاکہ رافضیوں کی مشابہت نہ ہو اور شریعت کے تقاضے پورے ہوں۔

کرونا کی وجہ سے عیدین گھر میں پڑھنے کا حکم

سوال:(5)

کیا وبا کے زمانہ میں عیدین کی نماز گھروں میں پڑھنے کی اجازت ہوگی؟

جواب:(5)

وبائی حالات میں، جیسے کہ کرونا وائرس کے پھیلاؤ کے دوران، عیدین کی نماز کے بارے میں فقہِ حنفی کی روشنی میں چند اصول و احکام پیش کیے جاتے ہیں:

فقہِ حنفی کے مطابق، عیدین کی نماز واجب ہے اور اس کی ادائیگی کے لیے مخصوص شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، جن میں جماعت، اذان و اقامت کی عدمِ ضرورت، اور عیدگاہ یا مسجد جیسے کھلے مقام پر ادا کرنا شامل ہے۔ البتہ، اگر کوئی شرعی عذر (جیسے وبا یا بیماری کا خوف) موجود ہو تو اس میں کچھ تخفیف اور رعایت دی جا سکتی ہے۔

درمختار میں آیا ہے:

"اذا منع السلطان الناس عن الخروج الی العید یصلون فی بیوتھم اربعا کما فی المحیط" (درمختار مع ردالمحتار، ج۳، ص۶۵)

ترجمہ: اگر بادشاہ (یا حکومتی پابندی) لوگوں کو عیدگاہ جانے سے روک دے، تو لوگ اپنے گھروں میں چار رکعت نفل نماز پڑھ سکتے ہیں، جیسا کہ "المحیط" میں ہے۔

اسی طرح فتاویٰ شامی میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ اگر جماعت کے لیے عذر ہو، تو نماز عید کی ادائیگی ممکن نہ ہونے کی صورت میں گھر میں انفرادی طور پر نفل نماز پڑھنی چاہیے۔

لہٰذا، کرونا جیسی وبائی صورتحال میں اگر مساجد یا عیدگاہ میں نمازِ عید ادا کرنا ممکن نہ ہو، یا حکومت کی طرف سے پابندی ہو، تو لوگ اپنے گھروں میں عید کی نماز نہیں پڑھ سکتے، بلکہ اس کی جگہ نفل نماز انفرادی طور پر پڑھ لیں۔

خلاصہ حکم:

۱- اگر شرعی عذر کی وجہ سے عیدگاہ یا مسجد میں نماز ممکن نہ ہو تو گھروں میں نفل نماز ادا کی جا سکتی ہے۔

۲- جماعت کے بغیر گھر میں عیدین کی نماز فقہِ حنفی کے اصول کے مطابق درست نہیں ہے۔

کرونا کی وجہ سے ماسک لگا کر اور فاصلہ سے نماز پڑھنے کا حکم

سوال: (6)

ماسک لگا کر نماز پڑھنے اور صفوں کے درمیان فاصلہ رکھنے کا حکم کیا ہے؟

جواب:(6)

کرونا جیسی وبائی بیماری کے دوران ماسک لگا کر نماز پڑھنے اور صفوں کے درمیان فاصلہ رکھنے کے بارے میں فقہ حنفی کی روشنی میں درج ذیل نکات قابل ذکر ہیں:

1- ماسک لگا کر نماز پڑھنا:

ماسک چہرے کو مکمل طور پر ڈھانپتا ہے، لیکن یہ نماز کے فریضہ میں رکاوٹ نہیں بنتا، کیونکہ اس سے نہ قرائت متاثر ہوتی ہے اور نہ سجدے میں کسی قسم کی دشواری ہوتی ہے۔

فقہ حنفی میں یہ اصول موجود ہے کہ جب کسی اضطراری حالت میں کوئی عمل کیا جائے اور وہ نماز کے ارکان وشرائط میں خلل نہ ڈالے تو وہ عمل معاف ہے۔ جیسا کہ فتاویٰ شامی میں ہے:

"**ویعفی عن کل ضرورة ملجئة إلی ذلک العمل**" (ردالمحتار، کتاب الطہارۃ)

لہٰذا، اگر وبا سے حفاظت کے لیے ماسک پہننا ضروری ہو تو نماز اس کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔

۲-صفوں کے درمیان فاصلہ رکھنا:

صفوں کے درمیان فاصلہ رکھنا سنتِ موکدہ کے خلاف ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے صفوں کو درست کرنے اور قریب کرنے کا حکم دیا ہے:

"سووا صفوفکم فإن تسویة الصفوف من تمام الصلاة" (صحیح بخاری، کتاب الأذان)

لیکن اگر وبائی بیماری کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے فاصلہ رکھنا ناگزیر ہو تو یہ مجبوری کے طور پر معاف ہے، کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے:

"الضرورات تبیح المحظورات" (الأشباہ والنظائر، القاعدة الخامسة)

یہی وجہ ہے کہ اس دورانیے میں حفاظتی تدابیر کے ساتھ نماز ادا کرنا جائز ہے۔

خلاصہ:

وبائی بیماری کے دوران ماسک لگا کر نماز پڑھنا اور صفوں کے درمیان فاصلہ رکھنا ضرورت کی وجہ سے جائز ہے۔ لیکن جیسے ہی یہ مجبوری ختم ہو، صفوں کو ملانے اور سنتِ موکدہ پر عمل کرنا لازم ہوگا۔

کرونا سے متأثر افراد کے لئے مسجد آنے کا حکم

سوال: (7)

کرونا سے متاثر افراد کا مسجد آنا اور جماعت میں شریک ہونا کیسا ہے؟

جواب: (7)

کرونا یا کسی دیگر متعدی بیماری سے متاثر شخص کا مسجد میں آنا اور جماعت

میں شریک ہونا فقہ حنفی کی روشنی میں ممنوع ہے، کیونکہ اس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے، جو شرعی طور پر ناجائز ہے۔ فقہ حنفی میں ''لاضرر ولاضرار'' کا اصول موجود ہے، جس کا مطلب ہے کہ کسی کو نقصان پہنچانا یا نقصان برداشت کرنا جائز نہیں۔

دلائل:

۱- فقہ حنفی کی مستند کتاب الدر المختار میں ذکر ہے:

''**ولا يجوز لمن كان فيه مرض معدٍ أن يخالط الناس دفعاً للضرر عنهم**'' (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 6، صفحہ 384)

یعنی: ''ایسے شخص کو جسے متعدی بیماری ہو، لوگوں سے میل جول کرنے کی اجازت نہیں ہے تاکہ دوسروں کو نقصان نہ پہنچے''۔

۲- اسی طرح البحر الرائق میں واضح کیا گیا ہے:

''**إذا كان الشخص في حال يتضرر به غيره، يُمنع من مخالطة الناس حفظاً لحقوقهم**'' (البحر الرائق، جلد 8، صفحہ 223)

یعنی: ''اگر کسی شخص کی حالت ایسی ہو کہ دوسروں کو نقصان پہنچے، تو اسے لوگوں کے ساتھ میل جول سے روکا جائے گا تاکہ ان کے حقوق محفوظ رہیں''۔

شرعی حکم:

ایسے افراد کو چاہیے کہ وہ مسجد آنے اور جماعت میں شریک ہونے سے گریز کریں تاکہ دوسروں کو تکلیف یا بیماری نہ پہنچے۔ ایسے حالات میں ان پر شرعی طور پر گھر

میں نماز ادا کرنا واجب ہوگا، کیونکہ اجتماع میں شرکت کرنے کی شرط یہ ہے کہ اس سے کسی دوسرے کو نقصان نہ ہو۔

کرونا کے مریض کے لئے روزہ کا حکم

سوال:(8)

کرونا سے متاثر افراد کے لئے روزہ کا کیا حکم ہے؟

جواب:(8)

کرونا جیسی بیماری سے متاثر افراد کے روزے کے حکم کے بارے میں فقہ حنفی کی روشنی میں یہ بات سمجھنی ضروری ہے کہ روزہ ہر مسلمان، بالغ، عاقل اور صحت مند فرد پر فرض ہے، بشرطیکہ وہ سفر میں نہ ہو۔لیکن اگر کوئی شخص بیماری کی حالت میں ہو اور روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کی بیماری بڑھنے کا اندیشہ ہو یا شفاء میں تاخیر ہو، تو شریعت نے اسے روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی ہے، اور بعد میں صحت یاب ہونے کے بعد ان روزوں کی قضاء لازم ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب الدرالمختار میں ہے:

”والمریض ان خاف زیادۃ المرض او بطء البرء افطر“

(الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الصوم، جلد۳، صفحہ۴۲۱)

ترجمہ: بیمار شخص اگر روزہ رکھنے سے مرض بڑھنے یا صحت یابی میں تاخیر کا اندیشہ رکھتا ہو تو وہ روزہ توڑ سکتا ہے (یا نہ رکھ سکتا ہے)۔

اسی طرح الفتاوی الہندیہ میں ہے:

"إن كان به مرض لو صام زاد المرض أو خاف بطء البرء جاز له الفطر" (الفتاوی الہندیہ، جلد ۱، صفحہ ۲۰۷)

یعنی اگر بیمار شخص کو یقین یا غالب گمان ہو کہ روزہ رکھنے سے بیماری بڑھ جائے گی یا شفاء میں تاخیر ہوگی تو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔

کرونا سے متاثرہ افراد کے لئے بھی یہی حکم ہوگا، بشرطیکہ کوئی معتبر مسلمان ڈاکٹر یا ماہر طبیب یہ کہے کہ روزہ رکھنے سے بیماری کے بڑھنے کا اندیشہ ہے، یا شفاء میں تاخیر ہوسکتی ہے۔ اگر ایسا اندیشہ نہ ہو تو روزہ رکھنا ضروری ہے۔

کرونا کی وجہ سے حج وعمرہ سے روکنے کا حکم

سوال: (9)

کیا کرونا کی وجہ سے عام مسلمانوں کو حج وعمرہ سے روکا جاسکتا ہے؟

جواب: (9)

فقہ حنفی میں حج وعمرہ کی فرضیت کے لیے استطاعت شرط ہے، جیسا کہ قرآن

کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" (سورۃ آل عمران:97)

کرونا یا کسی بھی وبا کی صورت میں اگر عوامی تحفظ کے لیے حکومت شرعی قواعد کے دائرے میں رہتے ہوئے حج وعمرہ پر پابندی لگائے، تو یہ عارضی طور پر درست ہے۔ فقہ حنفی میں اس کے اصول ملتے ہیں کہ کسی ایسے معاملے میں جہاں جان کو خطرہ ہو یا عمومی ضرر لاحق ہو، وہاں پیش بندی جائز ہے۔

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

"دفع الضرر العام أولى من دفع الضرر الخاص" (المبسوط:10/145)

یعنی عمومی ضرر کو دفع کرنا انفرادی ضرر کو دفع کرنے سے زیادہ اہم ہے۔

اسی طرح امام کاسانیؒ لکھتے ہیں:

"الأمر إذا دار بين دفع الضرر وجلب المنفعة، كان دفع الضرر أولى" (بدائع الصنائع:7/269)

یعنی جب معاملہ دفع ضرر اور منفعت حاصل کرنے کے درمیان ہو، تو ضرر کو دفع کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔

لہٰذا، اگر کرونا جیسی وبا کی شدت کے وقت عوام کی جان وصحت کو خطرہ ہو اور حکومت عوامی بھلائی کے پیش نظر حج وعمرہ پر عارضی پابندی لگائے، تو یہ شرعاً جائز ہے۔

ایسے حالات میں استطاعت کے فقدان کی وجہ سے حج فرض بھی نہیں ہوگا، اور عمرہ کو موقوف رکھنا بھی درست ہوگا۔

محورسوم: کرونا کے زمانے میں مساجد سے متعلق مسائل

کرونا کی وجہ سے مساجد کو بند کرنے کا حکم

سوال:(1)

کرونا کے زمانے میں مساجد کو بند کرنا کیسا ہے؟

جواب:(1)

کرونا جیسی وبا کے دوران مساجد کو بند کرنے کے متعلق حکم فقہِ حنفی اور دیگر اسلامی اصولوں کی روشنی میں یہ ہے کہ مساجد کو مکمل طور پر بند کرنا اور نماز با جماعت کو ترک کرنا جائز نہیں، کیونکہ مسجدیں اللہ کے ذکر کے لیے ہیں اور ان کو بند کرنا شرعاً ناپسندیدہ ہے۔

البتہ، شریعت نے انسانی جان کی حفاظت کو بھی اہمیت دی ہے۔ اس لیے اگر وبا کی شدت اتنی زیادہ ہو کہ لوگوں کے اجتماع سے جان کو حقیقی خطرہ لاحق ہو، تو ایسے وقت میں کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں، جیسے محدود تعداد میں نمازیوں کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دینا یا مناسب فاصلہ قائم رکھنا۔

فقہ حنفی کی مستند عبارت:

فقہ حنفی کی کتاب ''الدر المختار'' میں آیا ہے:

''**ولكل مكلف أن يحضر الجماعة في المسجد إذا لم يكن له عذر كمرض أو خوف على النفس أو المال**'' (الدر المختار مع رد المحتار، ج1،ص 551،دار الفکر)

اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ جماعت میں شریک ہونا عام حالات میں ضروری ہے، لیکن اگر کوئی عذر ہو، جیسے مرض یا جان کا خطرہ، تو رخصت دی گئی ہے۔

دیگر حوالے:

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''**إذا تحقق الخطر على النفس جاز ترك الجماعة حتى يزول العذر**'' (رد المحتار، ج1،ص552، دار الفکر)

لہٰذا، کرونا جیسی وبا کے دوران اگر طبی ماہرین کی جانب سے واضح طور پر یہ کہا جائے کہ اجتماع سے بیماری کا پھیلاؤ یقینی ہے، تو ایسی حالت میں شریعت لوگوں کو عذر کی رعایت دیتی ہے، اور اجتماعی عبادات کے طریقے میں عارضی تبدیلی کی اجازت ہے۔

لیکن اس کے باوجود مسجد کو مکمل طور پر بند کرنا اور اذان و نماز کو بالکل ترک کر دینا درست نہیں۔ اذان و اقامت کے ساتھ محدود تعداد میں نماز قائم کرنا بہتر اور مناسب طریقہ ہے۔

کرونا کی وجہ سے جماعت موقوف ہونے کی صورت میں اذان کا حکم

سوال:(2)

کیا جماعت موقوف ہونے کی صورت میں اذان دی جائے گی؟

جواب:(2)

جماعت کے موقوف ہونے کی صورت میں اذان کے حکم کے بارے میں فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں وضاحت ملتی ہے۔ اصولی طور پر اذان فرض نماز کے لیے مشروع ہے، اور یہ نماز کے اعلان اور جماعت کے لیے دعوت کا ذریعہ ہے۔ اگر جماعت نہ ہو، تب بھی اذان دینے کا حکم باقی رہتا ہے، کیونکہ اذان نماز کے شعائر میں سے ہے اور اس کے ذریعے نماز کا وقت معلوم ہوتا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ "ردالمحتار" میں فرماتے ہیں:

"وتسنّ الأذان وإن صلّى وحده؛ لأنها من شعائر الإسلام"

(ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب الأذان، جلد 1، صفحہ 260)

یعنی اذان دینا سنت ہے، چاہے کوئی فرد تنہا نماز پڑھ رہا ہو، کیونکہ اذان اسلام کے شعائر میں سے ہے۔

اسی طرح امام حصکفیؒ "الدر المختار" میں لکھتے ہیں:

"والأذان مشروع للإعلام بدخول الوقت ولو لم يكن

جماعة" (الدر المختار، کتاب الصلاۃ، باب الأذان، جلد 1، صفحہ 259)

خلاصہ یہ ہے کہ جماعت موقوف ہونے کی صورت میں بھی اذان دی جائے گی، کیونکہ اذان کا تعلق صرف جماعت کے ساتھ نہیں، بلکہ یہ نماز کے وقت کے اعلان اور شعائرِ اسلام کے قیام سے ہے۔

نمازیوں کی تعداد کے بارے میں حکومت کی ہدایات کا حکم

سوال: (3)

جماعت میں کتنے افراد شریک ھوں اس بارے میں گورنمنٹ کی ہدایات کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟

جواب: (3)

کسی بھی ملک کی حکومت کے احکام اور قوانین کو شرعی حیثیت اس وقت دی جاتی ہے جب وہ احکام شریعت کے دائرے میں ہوں اور ان کا مقصد عوامی فلاح و بہبود ہو۔ اگر حکومت کی جانب سے کسی خاص حالت، جیسے وبائی امراض یا دیگر سنگین خطرات کے پیشِ نظر، جماعت میں افراد کی تعداد محدود کرنے کا حکم دیا جائے، تو شرعی طور پر اس کی پابندی ضروری ہوگی، بشرطیکہ یہ حکم مسلمانوں کے دینی فرائض اور عبادات میں غیر ضروری رکاوٹ نہ ڈالے۔

فقہ حنفی میں اس اصول کی بنیاد لاضرر ولاضرار کے قاعدے پر ہے، جو مشہور

حدیث سے ماخوذ ہے:

"لا ضرر ولا ضرار في الإسلام" (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 2340)

اس اصول کے تحت اگر کسی عمل سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، تو اس سے اجتناب واجب ہے۔ وبا کے دوران بڑی جماعت کا اکٹھا ہونا ممکنہ نقصان یا بیماری کے پھیلاؤ کا سبب بن سکتا ہے، لہٰذا ایسی صورت میں گورنمنٹ کی ہدایات کی پابندی کرنا شرعاً واجب ہوگا۔

فقہ حنفی کی کتاب ردالمحتار علی الدر المختار میں یہ وضاحت ملتی ہے:

"والحاصل أن كل ما كان فيه دفع الضرر العام يعتبر من المصالح المعتبرة شرعاً" (ردالمحتار، جلد 1، صفحہ 342)

اس عبارت سے واضح ہے کہ عوامی نقصان کو روکنے کے لیے جو اقدامات شرعی اصولوں کے مطابق ہوں، وہ معتبر ہیں۔

لہٰذا، اگر حکومت کا یہ حکم عام لوگوں کی صحت اور حفاظت کے پیش نظر ہے اور اس میں عبادات کے لیے کوئی متبادل انتظام موجود ہے (جیسے گھروں میں جماعت کرنا یا محدود افراد کے ساتھ مساجد میں نماز ادا کرنا)، تو اس کی پابندی کرنا شریعت کے مطابق ہے۔

مسجد کے کسی حصہ کو کووڈ سینٹر بنانے کا حکم

سوال: (4)

مساجد کے کسی حصے یا اس سے ملحق جگہ کو کووڈ سینٹر بنانا کیسا ہے؟

جواب:(4)

مساجد اللہ کے گھر ہیں، جن کا بنیادی مقصد عبادتِ الٰہی اور ذکر واذکار کے لیے مختص ہونا ہے۔ شریعتِ مطہرہ میں مساجد کی پاکیزگی، تقدس اور ان کے خاص مصرف کو برقرار رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا" (سورۃ الجن:18)

ترجمہ: اور بیشک مسجدیں اللہ کے لیے خاص ہیں، تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔

فقہ حنفی کی رو سے مسجد کی زمین وقف ہو جانے کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے عبادت کے لیے مخصوص ہو جاتی ہے، اور اسے کسی دوسرے مصرف میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، خواہ وہ مقصد کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔

فتاویٰ عالمگیری میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے:

"ولا يجوز تغيير المسجد عن وضعه، لأنه قد صار وقفًا لله تعالى" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 2، صفحہ 446)

ترجمہ: مسجد کو اس کی اصل حیثیت سے تبدیل کرنا جائز نہیں، کیونکہ وہ اللہ کے لیے وقف ہو چکی ہے۔

مسجد سے ملحق جگہ، اگر وہ مسجد کے وقف میں شامل ہو، تو اس پر بھی یہی حکم لاگو ہوگا۔ البتہ اگر وہ جگہ مسجد کا حصہ نہ ہو اور صرف مسجد کے قریب ہو، تو وہاں کووڈ سینٹر یا دیگر ضرورت کے لیے استعمال کی گنجائش نکل سکتی ہے، بشرطیکہ اس سے مسجد کے

تقدس اور نماز ادا کرنے والوں کی سہولت پر کوئی اثر نہ پڑے۔

الدر المختار میں یہ تصریح موجود ہے:

"الأماكن الموقوفة للمسجد لا يجوز استعمالها في غير ماوقفت له" (الدر المختار مع رد المحتار، جلد 3، صفحہ 370)

ترجمہ: مسجد کے لیے وقف جگہ کو کسی اور مقصد کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

لہٰذا، مسجد کے اندرونی حصے کو کووڈ سینٹر بنانا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ مسجد کے اصل مقصد کے خلاف ہے۔ تاہم، مسجد سے ملحق کوئی غیر وقف جگہ اگر موجود ہو، تو عوامی ضرورت کے پیش نظر وہاں کووڈ سینٹر بنایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ مسجد کی حرمت متاثر نہ ہو۔

محور چهارم: کرونا سے متاثر مریض کی تیمارداری:

کرونا کے مریض کی تیمارداری کا حکم

سوال: (1)

کرونا سے متاثر مریض کو الگ تھلگ کر دینا اور اس کی تیمارداری نہ کرنا کیسا ہے؟

جواب: (1)

اسلام نے بیماروں کی عیادت اور ان کی خدمت کو ایک اہم اخلاقی اور دینی

فریضہ قرار دیا ہے۔ بیمار کی تیمارداری نبی اکرم ﷺ کی سنت اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی اہم بنیاد ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"عُودُوا الْمَرِيضَ" (صحیح بخاری، حدیث نمبر 5673)

ترجمہ: بیمار کی عیادت کرو۔

تاہم، جہاں بیمار کی تیمارداری ایک عظیم عمل ہے، وہاں شریعت نے نقصان سے بچنے اور دوسروں کو محفوظ رکھنے کی بھی تعلیم دی ہے۔ اگر مریض کا مرض متعدی ہو، تو شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اس کو الگ تھلگ رکھا جائے تاکہ بیماری دوسروں تک نہ پھیلے۔ حدیث شریف میں ہے:

"لا يُورِدُ مُمْرِضٌ علَى مُصِحٍّ" (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2221)

ترجمہ: بیمار کو صحت مند کے ساتھ نہ لایا جائے۔

فقہ حنفی میں بھی متعدی امراض سے احتیاط کی تعلیم دی گئی ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"لا بأس بالاحتراز عن الأمراض المعدية إذا كان ذلك لدفع الضرر عن النفس والغير" (فتاویٰ عالمگیری، جلد 5، صفحہ 354)

ترجمہ: متعدی بیماریوں سے بچاؤ میں کوئی حرج نہیں، اگر یہ اپنی یا دوسروں کی حفاظت کے لیے ہو۔

کرونا مریض کی تیمارداری کے لیے شرعی حکم:

۱- الگ تھلگ کرنا:

اگر کسی کو کرونا جیسی متعدی بیماری ہو، تو اسے الگ تھلگ کرنا شرعاً جائز ہے، بلکہ لازم ہوگا، کیونکہ یہ بیماری کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے ایک ضروری اقدام ہے۔ یہ شریعت کے اس اصول کے مطابق ہے:

"**الضرر یزال**" (الاشباہ والنظائر، صفحہ 75)

ترجمہ: نقصان کو دور کیا جائے۔

۲- تیمارداری نہ کرنا:

تیمارداری نہ کرنے کا عمومی عمل، اگر صرف بیماری کے خوف کی وجہ سے ہو، تو مناسب نہیں ہے۔ تیمارداری ایک اسلامی فریضہ ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تیمارداری کرنے والا احتیاطی تدابیر اپنائے، جیسے ماسک پہننا، فاصلہ رکھنا، اور دیگر حفاظتی تدابیر اختیار کرنا۔

خلاصہ:

کرونا سے متاثر مریض کو الگ تھلگ کرنا شریعت کے اصولوں کے عین مطابق ہے، کیونکہ اس سے دوسروں کو نقصان سے بچایا جاتا ہے۔ تیمارداری کرنا ایک

دینی فریضہ ہے، لیکن متعدی بیماری کے دوران یہ فریضہ حفاظتی تدابیر کے ساتھ انجام دینا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے تیمارداری نہ کی جا سکے، تو کم از کم دعا اور دیگر مدد کے ذریعے مریض کا خیال رکھا جائے۔

کرونا کا مریض اگر اپنے علاج کا متحمل نہ ہو تو کیا حکم ہے؟

سوال:(2)

کرونا سے متاثر مریض کے علاج کا خرچ اگر خاندان کے افراد برداشت نہ کر سکیں تو حکومت یا سماج کی کیا ذمہ داری ہوتی ہے؟

جواب:(2)

اسلامی شریعت میں کسی بھی بیمار انسان کے علاج معالجہ کو نہایت اہمیت دی گئی ہے، خصوصاً جب وہ خود یا اس کا خاندان اس اخراجات کو برداشت کرنے کے قابل نہ ہو۔ ایسے حالات میں اسلامی معاشرے اور حکومت کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے، کیونکہ شریعت نے فرد کے حقوق اور معاشرتی فلاح و بہبود کو مضبوطی سے جڑ دیا ہے۔

حکومت اور سماج کی ذمہ داری:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مالداروں کو سماجی فلاح کے لیے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے:

''وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ'' (سورۃ الذاریات:19)

ترجمہ: اور ان کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم کا حق ہے۔

اسی طرح، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''الإمامُ راعٍ وهو مسؤولٌ عن رعيتِه'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر 893)

ترجمہ: امام (حکمران) چرواہے کی مانند ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔

فقہ حنفی کی کتابوں میں یہ اصول واضح کیا گیا ہے کہ حکمران کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کی ضروریات کو پورا کرے، خصوصاً ان مواقع پر جب فرد اپنی مدد آپ کرنے کے قابل نہ ہو۔ الدرالمختار میں ہے:

''إذا عجزَ الأفرادُ عن تَحمُّلِ نفقاتهم، وجبَ على الحاكم أن يتدخلَ في تلبيةِ حاجاتهم الأساسية من بيتِ المال'' (الدرالمختار مع ردالمحتار، جلد 2، صفحہ 331)

ترجمہ: جب افراد اپنی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہوں، تو حکمران پر واجب ہے کہ بیت المال سے ان کی بنیادی ضروریات پوری کرے۔

موجودہ صورتحال میں حکومت کی ذمہ داری:

کرونا جیسی وبا کے دوران:

ا-حکومت پر لازم ہے کہ وہ ایسے افراد کے علاج کا خرچ اٹھائے جو اس کی

استطاعت نہ رکھتے ہوں، کیونکہ یہ اجتماعی فلاح کے زمرے میں آتا ہے۔

۲- زکوٰۃ، صدقات، اور دیگر رفاہی فنڈز کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ فقہ حنفی میں مستحقین کی مدد کے لیے زکوٰۃ کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔

سماج کی ذمہ داری:

سماج کے صاحب استطاعت افراد پر لازم ہے کہ وہ ان مریضوں کی مدد کریں جن کے پاس وسائل نہیں۔ حدیث میں آتا ہے:

"مَثَلُ المؤمنینَ فی تَوَادِّهم وتراحُمِهم وتعاطُفِهم مَثَلُ الجسدِ الواحدِ" (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2586)

ترجمہ: مسلمانوں کی مثال باہمی محبت اور رحم دلی میں ایک جسم کی مانند ہے۔

خلاصہ:

اگر کرونا سے متاثر مریض کے علاج کا خرچ خاندان برداشت نہ کر سکے، تو حکومت پر لازم ہے کہ وہ ان مریضوں کے علاج کا انتظام کرے اور بیت المال یا رفاہی فنڈز سے ان کی مدد کرے۔ ساتھ ہی سماج کے صاحب استطاعت افراد بھی ان کی مالی معاونت کریں تاکہ علاج معالجہ جاری رہے اور انسانی جانوں کو بچایا جا سکے۔ یہ شریعت اسلامی کے عمومی اصول دفع الضرر کے عین مطابق ہے۔

محور پنجم: کرونا سے فوت ہونے والے افراد کی نماز جنازہ اور غسل سے متعلق مسائل

کرونا کی وجہ سے مرنے والے کے غسل کا حکم

سوال:(1)

کرونا سے انتقال کرنے والوں کو غسل کس طرح دیا جائے؟ اگر غسل دینے کی اجازت نہ ہو یا غسل ممکن نہ ہو تو کیا کیا جائے؟ کیا بلا غسل دفن کرنا جائز ہوگا؟

جواب:(1)

اسلام میں میت کو غسل دینا فرض کفایہ ہے اور اس کے بغیر میت کی تدفین کو ناقص سمجھا جاتا ہے۔لیکن اگر کسی خاص حالت میں، جیسے وبائی مرض کرونا کے دوران، غسل دینا ممکن نہ ہو یا اس میں جان کا خطرہ ہو، تو شریعت نے اس حوالے سے آسانی فراہم کی ہے۔

1-کرونا سے انتقال کرنے والوں کو غسل کا حکم:

شریعت کا عمومی حکم یہ ہے کہ میت کو تین بار پانی کے ساتھ دھویا جائے اور آخری بار پانی میں کافور ملایا جائے۔حدیث مبارکہ میں آتا ہے:

"اغْسِلْنَهَا ثَلاثًا أَوْ خَمْسًا أَوْ أَكْثَرَ، إِنْ رَأَيْتُمْ ذَلِكَ، بِمَاءٍ وَسِدْرٍ" (صحیح بخاری، حدیث نمبر 1253)

ترجمہ: اسے تین، پانچ یا زیادہ بار پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو، جیسا تم مناسب سمجھو۔

فقہ حنفی میں بھی غسل کا یہی اصول بیان کیا گیا ہے، لیکن اگر وبا یا کسی دوسرے عذر کی بنا پر غسل دینا ممکن نہ ہو، تو متبادل طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ غسل نہ دینے کی صورت میں حکم:

اگر غسل دینا ممکن نہ ہو یا اس میں بیماری کے پھیلنے کا خطرہ ہو، تو متعدی امراض کے حوالے سے فقہ حنفی میں تیمّم کا حکم موجود ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"وإذا تعذّر الغسلُ لِعُذْرٍ، يُمّمَ الميتُ تيممًا" (فتاویٰ عالمگیری، جلد، صفحہ 160)

ترجمہ: اگر کسی عذر کی بنا پر غسل ممکن نہ ہو، تو میت کا تیمّم کرایا جائے۔

تیمّم کے لیے میت کے ہاتھ اور چہرے پر پاک مٹی کا مسح کیا جائے گا۔

۳۔ بلا غسل دفن کرنے کا حکم:

اگر غسل دینا اور تیمّم کرنا دونوں ممکن نہ ہوں (جیسے حکومتی اجازت نہ ہو یا خطرہ زیادہ ہو)، تو شریعت ایسی حالت میں بلا غسل میت دفن کرنے کی اجازت دیتی ہے۔

یہ اصول الضرورات تبیح المحظورات (ضرورتیں ممنوع چیزوں کو

مباح کر دیتی ہیں) پر مبنی ہے۔

الدر المختار میں ہے:

"وَإِذَا خِيفَ الضَّرَرُ فِي الْغُسْلِ يَسْقُطُ وَيُكْتَفَى بِالدَّفْنِ"

(الدر المختار مع رد المحتار، جلد 3، صفحہ 100)

ترجمہ: اگر غسل میں نقصان یا خطرہ ہو، تو غسل ساقط ہو جائے گا اور دفن پر اکتفا کیا جائے گا۔

خلاصہ:

۱-کرونا سے انتقال کرنے والوں کو ممکن ہو تو حفاظتی تدابیر کے ساتھ غسل دیا جائے۔

۲-اگر غسل دینا ممکن نہ ہو یا خطرناک ہو، تو تیمّم کیا جائے۔

۳-اگر غسل اور تیمّم دونوں ممکن نہ ہوں، تو بلا غسل میت کو دفن کرنا جائز ہے۔

یہ سب شریعت کی رعایت اور انسانی جان کی حفاظت کے اصول کے تحت ہے۔

کرونا کے مریض کے کفن کا حکم

سوال:(2)

اگر کرونا کے میت کو ہسپتال کی طرف سے مخصوص کور میں لپیٹ کر دیا جائے۔ اور اسے کھولنے اور ہٹانے کی اجازت نہ ہو تو کیا وہ کور کفن کے حکم میں ہوگا؟ یا اس کے

اوپر کفن لپیٹ کر دفن کیا جائے گا؟

جواب:(2)

کرونا کے مریض کی میت کو اگر ہسپتال کی طرف سے کسی خاص کور میں لپیٹ دیا جائے اور اسے کھولنے کی اجازت نہ ہو، تو یہ کور کفن کے حکم میں نہیں ہوگا۔ فقہِ حنفی کے اصول کے مطابق میت کو کفن دینا واجب ہے، اور کفن کا مقصد میت کی عزت وستر ہے، جو مخصوص شرعی طریقے کے مطابق ہونا چاہیے۔

لہٰذا ایسی صورت میں ضروری ہوگا کہ اس کور کے اوپر شرعی کفن لپیٹ کر میت کو دفن کیا جائے۔ اگرچہ کور کھولنا ممکن نہ ہو، تب بھی کفن کا اہتمام کرنا لازم ہے، تاکہ کفن دینے کا شرعی حکم پورا ہو جائے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب الدر المختار میں ہے:

”**والكفن واجب للمرء ولو فاسقًا من ماله إذا خلف مالًا، فإن لم يكن فلزمه الغسلُ والصلاةُ والدفنُ، وأقلُّه ما يستُرُ البدنَ**“ (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الجنائز، باب الکفن، جلد 3، ص100)

اسی طرح فتاوی عالمگیری میں کفن کے واجب ہونے اور اس کی مقدار وکیفیت کی وضاحت موجود ہے:

”**والكفن على قدر ما يستر جميع البدن**“ (فتاوی عالمگیری، کتاب الجنائز، جلد 1، ص159)

اس لیے مذکورہ کور کو کفن کے طور پر قبول نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کے اوپر کفن لپیٹنا واجب ہوگا۔

کرونا کے مریض کو بغیر نماز جنازہ دفنانے کا حکم

سوال:(3)

اگر کرونا سے مرنے والے کی بغیر نماز جنازہ تدفین کے بعد گھر والوں کو اس کی اطلاع دی جائے تو ایسی صورت میں تدفین کے بعد قبر پر جنازے کی نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

جواب:(3)

اگر کرونا سے انتقال کرنے والے شخص کی تدفین بغیر نمازِ جنازہ کے کی گئی ہو اور تدفین کے بعد گھر والوں کو اس کی اطلاع دی جائے، تو ایسی صورت میں قبر پر جا کر نمازِ جنازہ ادا کرنا جائز ہے، بشرطیکہ میت کو دفن ہوئے زیادہ وقت نہ گزرا ہو اور میت کی حالت بوسیدگی کو نہ پہنچی ہو۔

فقہِ حنفی کے مطابق نمازِ جنازہ کا اصل مقام زمین پر ادا کرنا ہے، لیکن اگر کسی وجہ سے میت کی نمازِ جنازہ دفن سے پہلے ادا نہ کی جا سکی ہو، تو بعد میں قبر کے قریب جا کر بھی اسے پڑھا جا سکتا ہے۔

فقہ حنفی کی معتبر کتاب الدر المختار میں ہے:

''وإن دفن بغير صلاةٍ صلىٰ على القبر، ما لم يتغير'' (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الجنائز، باب صلاۃ الجنازۃ، جلد 3، ص 143)

اسی طرح فتاوی عالمگیری میں ہے:

''وإن دفن قبل أن يصلىٰ عليه، يصلىٰ على قبره، مالم يتغير''

(فتاوی عالمگیری، کتاب الجنائز، جلد 1، ص 163)

فقہاء کرام نے وضاحت کی ہے کہ مالم یتغیر کا مطلب یہ ہے کہ میت کی جسمانی حالت میں بوسیدگی یا خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو، کیونکہ ایسی صورت میں نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہوتا۔

لہٰذا، مذکورہ مسئلے میں میت کی تدفین کے بعد قبر پر جا کر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے، بشرطیکہ مذکورہ شرائط پوری ہوں۔

کرونا کے مریض کے انتقال کے بعد غائبانہ نماز جنازہ کا حکم

سوال: (4)

اگر میت کے دفن کرنے کی اطلاع ملے لیکن کہاں دفن کیا گیا ہے یہ معلوم نہ ہو تو کیا ایسی صورت میں غائبانہ نماز جنازہ کا کیا حکم ہے؟

جواب: (4)

فقہ حنفی کے مطابق غائبانہ نماز جنازہ (یعنی ایسی نماز جنازہ جو میت کی

غیر موجودگی میں ادا کی جائے) کا حکم مختلف ہے۔ اگر میت کی تدفین کے بعد کسی کو اطلاع ملے اور اس کے دفن کی جگہ معلوم نہ ہو، تو ایسی صورت میں غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ فقہ حنفی میں نماز جنازہ میت کے قریب پڑھنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے تاکہ دعا کا فائدہ میت تک پہنچ سکے۔

حوالہ:

امام کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ولا تجوز صلاة الجنازة على الميت الغائب عن المصر، سواء كان في المصر أو خارجه، لأنه لم يؤثر عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا عن أحد من الصحابة إلا في حق النجاشي وذلك كان خصوصاً له" (بدائع الصنائع، جلد 1، صفحہ 313)

یعنی نماز جنازہ غیر موجود میت پر جائز نہیں، خواہ میت شہر میں ہو یا شہر سے باہر، کیونکہ یہ عمل رسول اللہ ﷺ یا صحابہ کرام سے ثابت نہیں ہے، سوائے نجاشی کے معاملے میں جو ایک استثناء تھا۔

فقہ حنفی کی اصل:

فقہ حنفی میں عبادات میں نصوص کی اتباع کو لازم سمجھا جاتا ہے اور غائبانہ نماز جنازہ کو عام طور پر مشروع نہیں کہا گیا، کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ سے عمومی طور پر ثابت نہیں ہے۔

لہٰذا، اگر میت کہاں دفن ہوئی معلوم نہ ہو تو اس کے لیے غائبانہ نماز جنازہ ادا نہ کی جائے، بلکہ میت کے لیے دعا اور صدقہ و خیرات کرنا افضل عمل ہے۔

کیا کرونا کی وجہ سے مرنے والے شہید کہلائیں گے؟

سوال:(5)

کیا کرونا سے انتقال کرنے والے مسلمان شہید کہلائیں گے؟

جواب:(5)

اسلامی شریعت کی رو سے وہ مسلمان جو کسی وبائی مرض سے وفات پائے، شہید کے درجے میں شمار کیے جاتے ہیں۔ حدیثِ نبوی ﷺ میں طاعون (اور دیگر وبائی امراض) سے وفات پانے والے افراد کو شہید کہا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"الشُّهَدَاءُ خَمْسَةٌ: المَطْعُونُ، وَالمَبْطُونُ، وَالغَرِيقُ، وَصَاحِبُ الهَدْمِ، وَالشَّهِيدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ" (صحیح البخاری:2829، صحیح مسلم:1914)

ترجمہ: شہداء پانچ قسم کے ہیں: (۱) طاعون سے مرنے والا، (۲) پیٹ کی بیماری سے مرنے والا، (۳) پانی میں ڈوبنے والا، (۴) کسی عمارت کے گرنے سے مرنے والا، اور (۵) اللہ کی راہ میں شہید ہونے والا۔

فقہِ حنفی کی معتبر کتب میں بھی اس کی تصدیق ملتی ہے کہ طاعون یا وبائی مرض

سے وفات پانے والے افراد شہیدِ آخرت کہلاتے ہیں، یعنی انہیں آخرت میں شہادت کا درجہ دیا جائے گا، البتہ دنیا میں ان پر احکامِ شہداء (جیسے غسل نہ دینا) جاری نہیں ہوں گے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَأَمَّا شَهِيدُ الْآخِرَةِ فَهُوَ كُلُّ مُسْلِمٍ مَاتَ بِسَبَبٍ مِنَ الْأَسْبَابِ الَّتِي ذُكِرَتْ فِي الْأَحَادِيثِ كَالْمَطْعُونِ وَالْمَبْطُونِ وَنَحْوِهِمَا" (ردالمحتار علی الدرالمختار، ج2، ص270)

لہٰذا، کرونا جیسے وبائی مرض سے وفات پانے والے مسلمان، اگر وہ ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوں، تو انہیں بھی شہیدِ آخرت کہا جائے گا۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور درجات کی بلندی کی دعا کی جانی چاہیے۔

محور ششم: کرونا ویکسین سے متعلق مسائل

سینٹا ئزر کے استعمال کا حکم

سوال: (1)

الکحل آمیز سینیٹائزر کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

جواب: (1)

الکحل آمیز سینیٹائزر کا استعمال شرعی اعتبار سے چند امور پر موقوف ہے۔

فقہ حنفی میں نجاست کی تعریف اور اس کے مختلف اقسام کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ الکحل کس قسم کی نجاست میں شمار ہوتی ہے اور اس کا استعمال کس حد تک جائز ہے۔

1-الکحل کی شرعی حیثیت:

فقہاء کے نزدیک الکحل اگر انگور یا کھجور سے بنی ہو اور اس کا استعمال نشہ آور ہو، تو یہ شرعاً "خمر" کہلاتی ہے، اور خمر مطلقاً حرام اور ناپاک ہے۔ لیکن اگر الکحل کسی اور ذریعے سے حاصل کی گئی ہو، جیسے صنعتی مقاصد کے لیے بنائی گئی ہو، تو اس کی حیثیت مختلف ہوگی۔

جیسا کہ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے "البحر الرائق" میں ذکر کیا:

"أن الخمر ما اتخذ من عصير العنب إذا غلا واشتد وقذف بالزبد، وأما غيره فلا يلحق به إلا إذا شاركه في العلة وهي الإسكار"

(البحر الرائق، ج1، ص45)۔

۲-سینیٹائزر کا حکم:

اگر سینیٹائزر میں استعمال ہونے والی الکحل خمر (انگور یا کھجور سے بنی ہوئی) نہ ہو، بلکہ صنعتی ہو، تو اس کے بارے میں فقہاء کی رائے میں تخفیف پائی جاتی ہے، کیونکہ وہ نہ پینے کے لیے استعمال ہوتی ہے اور نہ ہی وہ نشہ آور ہوتی ہے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جو اشیاء خمر کی تعریف میں داخل نہ ہوں، ان کا استعمال حاجت کی صورت میں جائز ہوگا، جب تک وہ نشہ آور نہ ہوں'' (فتاویٰ رشیدیہ، ص 113)

سینیٹائزر کا استعمال:

چونکہ سینیٹائزر کا مقصد طہارت حاصل کرنا ہے اور یہ بیرونی استعمال کے لیے بنایا جاتا ہے، اس لیے اس کا استعمال درج ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہوگا:

۱-اگر اس میں خمر والی الکحل شامل نہ ہو۔

۲-سینیٹائزر سے نماز یا دیگر عبادات میں خلل نہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ الکحل آمیز سینیٹائزر کا استعمال، جب تک وہ خمر سے حاصل نہ ہو اور صرف صفائی یا جراثیم کشی کے لیے ہو، جائز ہے۔

کرونا ویکسین لگانے کا حکم

سوال:(2)

کرونا ویکسین لگانے کا حکم کیا ہے؟ واجب ہے یا مباح ہے؟

جواب:(2)

کرونا ویکسین لگانے کا مسئلہ ایک جدید اور فقہی طور پر غور طلب مسئلہ ہے۔

فقہ حنفی اور اسلامی شریعت کی روشنی میں اس کے حکم کا دارومدار چند اصولی باتوں پر ہے:

۱-حفاظت جان کا شرعی اصول:

شریعت اسلامیہ نے انسانی جان کی حفاظت کو ایک اہم مقصد قرار دیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا:

”وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ“ (البقرۃ:195)

یعنی ”اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو“۔

اسی طرح حدیث مبارکہ میں فرمایا گیا:

”لا ضرر ولا ضرار“ (سنن ابن ماجہ:2340)

یعنی ”نہ نقصان پہنچاؤ اور نہ نقصان اٹھاؤ“۔

۲-ویکسین کی نوعیت اور تحقیق:

اگر کرونا ویکسین کے متعلق ماہرین طب یہ تصدیق کرتے ہیں کہ یہ وبا سے بچاؤ کا ایک مؤثر ذریعہ ہے اور اس کے مضر اثرات بہت کم یا نہ ہونے کے برابر ہیں، تو اس کی اجازت بلکہ بعض صورتوں میں اس کا استعمال مستحب یا واجب بھی ہوسکتا ہے۔

۳-وجوب یا اباحت کا حکم:

فقہ حنفی میں وجوب اس وقت لازم ہوتا ہے جب کوئی چیز قطعی طور پر فرض ہو یا اس کے ترک سے جان یا مال کو یقینی نقصان پہنچے۔ اگر ویکسین نہ لگانے سے اپنی

یا دوسروں کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو تو اس کا استعمال لازم (واجب) ہوگا۔

امام کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"حفظ النفس واجب، وكل ما يتوقف الواجب عليه فهو واجب"

(بدائع الصنائع:4/203)

یعنی "جان کی حفاظت واجب ہے، اور جو چیز واجب کے قیام پر موقوف ہو، وہ بھی واجب ہوتی ہے"۔

اگر خطرہ کم ہو اور محض احتیاط کے طور پر استعمال ہو تو ویکسین کا حکم مباح یا مستحب ہوگا، کیونکہ ایسی صورت میں اس کا ترک نقصان دہ نہیں ہوگا۔

۴-خلاصہ حکم:

اگر ماہرین کی رائے کے مطابق ویکسین لگانے سے وبا کا خطرہ کم ہو جائے اور جانوں کا تحفظ ممکن ہو تو اس کا استعمال بعض حالات میں واجب یا مستحب ہوگا۔

اگر اس کے اثرات غیر یقینی ہوں اور کوئی نقصان دہ عنصر شامل ہو، تو تحقیق کے بعد اباحت یا کراہت کا پہلو دیکھا جائے گا۔

احتیاطی تدابیر:

مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ مستند طبی ماہرین سے مشورہ کریں اور شریعت کے اصولوں کی روشنی میں عمل کریں۔

محور هفتم: کروناوائرس کے پھیلاؤ کو روکنے سے متعلق اسلامی ہدایات

وبا کے دفعیہ کے لئے اذان کا حکم

سوال:(1)

وبا کے دفعیہ کے لیے کیا اذان دی جاسکتی ہے؟

جواب:(1)

وبا کے دفعیہ کے لیے اذان دینا فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں ایک مشروع عمل کے طور پر ذکر نہیں کیا گیا۔ اذان کا اصل مقصد نماز کے لیے بلانا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے:

"**إذا حضرت الصلاة فليؤذن لكم أحدكم**"(صحیح بخاری، کتاب الأذان)

تاہم، تاریخ میں ایسے مواقع بھی دیکھے گئے ہیں جب مختلف آفات یا مصائب کے وقت اذان دی گئی، جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے "ردالمحتار" میں ذکر کیا ہے کہ زلزلہ، طاعون یا دیگر آفات کے وقت اذان دی گئی تاکہ دفعِ بلاء کی امید کی جائے۔ یہ عمل عوامی مصلحت اور رجوع الی اللہ کے لیے کیا جاتا ہے، بشرطیکہ شریعت کے دیگر اصولوں کے خلاف نہ ہو۔

"وفی التاتارخانیة: روی عن أبی یوسف رحمه الله: إذا نزلت بأهل قریة مصیبة من الظالم أو غیره فزعوا إلی الأذان"

(ردالمختار، ج2، ص65)

لہٰذا، وبا کے وقت اذان دینا ایک مباح عمل ہے، لیکن اسے شرعی حکم یا سنت سمجھ کر لازم قرار دینا درست نہیں۔ یہ محض ایک استحبابی امر کے طور پر کیا جا سکتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ سے رجوع اور اس کی رحمت کی دعا کی جائے۔ اس کے ساتھ احتیاطی تدابیر اور دعا و استغفار کا اہتمام کرنا زیادہ اہم ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے مصیبت کے وقت صبر، دعا، اور توبہ کی تعلیم دی ہے۔

وبا کے ازالہ کے لئے اجتماعی نماز یا دعاء کا حکم

سوال: (2)

کرونا یا وباء امراض کے ازالے کے لیے اجتماعی نماز پڑھنا یا اجتماعی دعاء کا اہتمام کرنا کیسا ہے؟

جواب: (2)

اسلامی شریعت میں دعا اور عبادات کا تعلق بندے کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کو

مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے۔ وبائی امراض کے خاتمے یا کسی بھی بلا اور آفت سے نجات کے لیے دعا اور استغفار کرنا نبی کریم ﷺ کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول رہا ہے۔

جہاں تک وبائی امراض کے ازالے کے لیے اجتماعی نماز یا اجتماعی دعا کا تعلق ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ یہ عمل شریعت کے عمومی اصولوں کے تحت ہو اور اس میں بدعت یا غیر شرعی امور شامل نہ ہوں۔

فقہ حنفی کے معتبر مصادر میں دعا اور استغفار کے لیے اجتماع کا ذکر مختلف مواقع پر ملتا ہے، جیسے قحط سالی کے وقت نماز استسقاء کا اہتمام کرنا۔ ''الدر المختار'' میں ذکر ہے:

''ویسن للناس الدعاء والاستغفار وقت النوازل والبلاء''

(الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ الاستسقاء، 2/493)

اسی طرح ''الفتاویٰ الہندیہ'' میں دعا اور استغفار کے اجتماعی طور پر کرنے کا ذکر قحط سالی اور مصیبت کے وقت کے حوالے سے ملتا ہے۔

''وینبغی للناس أن یجتمعوا ویدعوا ویتضرعوا عند وقوع المصائب'' (الفتاوی الہندیہ، کتاب الکراہیۃ، الفصل السادس، 5/323)

کرونا یا کسی وبائی مرض کے خاتمے کے لیے اگر مسلمان مسجد یا کسی مقام پر شریعت کے حدود میں رہ کر دعا کا اہتمام کریں تو یہ شرعی طور پر جائز ہے۔ اس کے

ساتھ ساتھ انفرادی عبادات، صدقات، اور گناہوں سے استغفار کا خصوصی اہتمام کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالی کی رحمت کو متوجہ کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔

خلاصہ:

یہ کہ اجتماعی دعا یا نماز شریعت کے دائرے میں ہو تو یہ جائز اور مستحب عمل ہے، بشرطیکہ اس میں شرعی احکامات کی خلاف ورزی نہ ہو۔

☆☆☆

MAKTABA HABIBUL UMMAT

JAMIA ISLAMIA DARUL ULOOM

MUHAZZABPUR P.O.SANJARPUR DISTT. AZAMGARH U.P. INDIA

Mobile: 09450546400